سلسلہ منشورات دینیات فیکلٹی - ۲

چار علمی مقالات

مولانا سعید احمد اکبرآبادی
صدر شعبہ سُنّی دینیات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

۱۹۶۷ء

سلسلۂ منشورات دینیات کمیٹی - ۲

پہلا ایڈیشن

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس
علی گڑھ

پیش لفظ

حامداً و مصلیاً

یہ مجموعہ جو اس وقت آپ کے پیشِ نظر ہے چار مقالات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلے دو مقالے علی الترتیب قرآن مجید کے دو لفظ "الصابئون" اور "الامیون" کی تحقیق پر مشتمل ہیں۔ تیسرا مقالہ آٹھویں صدی ہجری کے اندلسی شعرا کے ایک اہم تذکرے سے متعلق ہے۔ جب یہ مقالہ لکھا گیا تھا، یہ تذکرہ صرف مخطوطہ کی شکل میں محفوظ تھا، لیکن ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر احسان عباس صاحب نے اس کو اڈٹ کر کے ایک مقدمہ کے ساتھ دار الثقافۃ بیروت کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔ لیکن انھوں نے جن تین نسخوں پر اپنے اڈیشن کی بنیاد رکھی ہے ہمارا مخطوطہ اُن میں شامل نہیں ہے۔ اب رہا چوتھا اور اس مجموعہ کا آخری مقالہ "مالک بن نویرہ کا واقعہ اور حضرت خالد بن الولید" تو یہ عہد صدیقی کے ایک نہایت اہم تاریخی واقعہ کی اصل حقیقت کی تحقیق پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات جن مجلات میں شائع ہوئے ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) الصابئون:- سہ ماہی فکر و نظر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ جولائی ۱۹۶۳ء

(۲) الامیون:- ایضاً " اکتوبر ۱۹۶۳ء

(۳) آٹھویں صدی ہجری کے اندلسی شعرا کا ایک تذکرہ:- ارمغان علمی بخدمت پروفیسر محمد شفیع مرحوم منجانب "مجلس ارمغان علمی" لاہور ۱۹۵۵ء

(۴) مالک بن نویرہ کا واقعہ:- ماہنامہ "برہان" دہلی۔ جولائی ۱۹۵۶ء

یکم ستمبر ۱۹۶۶ء

سعید احمد اکبر آبادی

فہرست مضامین

الصابئون

قرآن مجید میں جو چند مقامات مشکل سمجھے گئے ہیں ان میں وہ آیت بھی شامل ہے جس میں صابئون کا ذکر اہلِ کتاب اور مومنین کے ساتھ کیا گیا اور ان سب کو ایک ہی حکم کے ماتحت رکھا گیا ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ آمنوا وَالَّذِیْنَ ھادوا وَالنصریٰ والصابئین من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولاخوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون"

(البقرۃ آیت ۶۲)

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے یہودی مذہب اختیار کیا اور نصاریٰ اور صابئین (بہرحال) جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے گا تو اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ان لوگوں کے لیے نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

بعینہٖ اسی مضمون کی ایک دوسری آیت نمبر ۶۹ سورۃ المائدہ کی ہے جس کے الفاظ بھی یہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ "وعمل صالحاً" کے بعد "فلھم اجرھم عند ربھم" کے الفاظ نہیں ہیں اور "ولاخوف" کے بجائے "فلاخوف" ہے۔

اشکال کی اصل بنیاد:

اشکال کی اصل بنیاد دو چیزیں ہیں۔ ایک آیت کا نفس مطلب دوسری یہ کہ صابئون سے کون سا طبقہ مراد ہے؟ جہاں تک نفس مطلب کا تعلق ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ آیت میں پہلے چار طبقات مومن، یہودی، نصرانی اور صابی کا ذکر علی الترتیب "اِنَّ" کے اسم کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور پھر بہ طور خبر یہ ارشاد فرمایا گیا کہ ان چاروں طبقات کے لوگوں

میں سے جو شخص بھی اللہ اور یوم آخر پر ایمان لے آئے گا اور عمل صالح کرے گا اس کے لیے اللہ کے پاس اس کا اجر ہو گا۔ اس کے لیے کوئی خوف نہیں ہو گا۔ اور نہ وہ غمگین ہو گا۔

اب سوال دو پیدا ہوتے ہیں :

(۱) جب "ان الذین آمنوا" سے خود یہ معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں تو پھر خبر کے مرتبہ میں ان کو بھی "من آمن باللہ" (جو بھی ایمان لے آئے گا) میں شامل کرنے کا کیا مقصد ہے؟

(۲) اس آیت میں مدار نجات صرف دو چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک ایمان اور دوسرے عمل صالح اور ایمان میں صرف ایمان باللہ اور بالیوم الآخر کا ذکر ہے۔ اس بنا پر مطلب یہ ہوا کہ ایک یہودی یا عیسائی یا صابی اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے (اور اسی مذہب کے ساتھ نسبت سے پکارے جانے کے باوجود) اگر اللہ اور یوم آخر پر ایمان لے آتا ہے اور عمل صالح کرتا ہے تو آخرت میں اس کی نجات ہو جائے گی۔

اس اشکال کے نمبر ایک کا جواب یہ ہے کہ "الذین آمنوا" سے وہ لوگ مراد ہیں جو رسمی طور پر مسلمانوں کے زمرہ میں داخل ہیں یعنی کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے اور مسلمان نام کی وجہ سے یا زبان سے کلمہ تشہد پڑھنے اور اپنے متعلق مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے کے باعث مومن سمجھے جاتے ہیں۔ رہا "من آمن" تو یہاں ایمان سے مراد سچ مچ مومن ہونا اور دل سے تصدیق کرنا ہے۔ اس بنا پر مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ رسمی طور پر مومن ہیں یا جو اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں[1] سے جو لوگ واقعی اور حقیقی مومن ہوں گے تو! قرآن میں اسی مضمون کو اور متعدد مواقع پر بھی بیان کیا گیا ہے: ایک جگہ فرمایا گیا "یا ایھا الذین آمنوا آمنو" اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو سچ مچ ایمان لاؤ۔ سورہ الحدید میں ہے "یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وآمنوا برسولہ" اے ایمان لانے والو اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر سچ مچ ایمان لاؤ۔ علاوہ بریں

---

[1] "من آمن" کے بعد "منھم" مقدر ہے تب ہی اس جملہ کا تعلق ماقبل کے ساتھ پیدا ہو سکتا ہے۔ تفسیر ابن جریر طبری مطبوعہ دارالمعارف مصر ج ۲ ص ۱۴۸

اعراب جو اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اُن کی نسبت فرمایا گیا "وقالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا و لما ید خل الایمان فی قلوبکم"۔ اعراب کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں" (مگر) آپ کہہ دیجیے "تم ایمان نہیں لائے"، مگر ہاں کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کرلی ہے اور ایمان اب تک تمہارے قلوب میں داخل نہیں ہوا ہے۔ ان سب آیات کو پیش نظر رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت مدار نجات وہ ایمان ہے جس میں تصدیق قلب پائی جائے۔ جب دل سے کسی چیز کی تصدیق ہوتی ہے تو زبان سے بھی وہی نکلتی اور عمل بھی اس کے مطابق ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہمارے متکلمین نے ایمان کی تعریف اور عمل کے ساتھ اس کے تعلق پر جو نکتہ آفرینیاں کی ہیں وہ کوہ کندن وکاہ برآوردن سے زیادہ وقیع نہیں قرآن نے "ولما ید خل الایمان فی قلوبکم" کہہ کر ایمان کی اصل حقیقت کو نہایت صاف اور واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ایمان کی قسمیں دو ہیں ایک حقیقی ایمان جس میں دل سے تصدیق پائی جائے اور دوسرا وہ ایمان جو محض رسمی اور ظاہری ہو۔ چونکہ ایمان حقیقی ہے یا نہیں؟ اس کا پتہ سوائے باری تعالےٰ کے کسی اور کو نہیں ہو سکتا اس بنا پر آخرت میں نجات کا دارومدار بھی ایمان ہے۔ مگر دنیوی معاملات میں وہ شخص بھی مومن سمجھا جائے گا جو محض رسمی ایمان رکھتا ہے، تاوقتیکہ اس کی زبان یا اس کے عمل سے کسی ایسی چیز کا صدور نہ ہو جو صریحاً کفر اور ایمان کی نقیض ہے۔ بعض مفسر ایسے مواقع پر لکھتے ہیں کہ آیت میں دوسرے آمنوا: کے معنیٰ "اثبتوا" ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو! ایمان پر ثابت قدم رہو۔ لیکن ہماری رائے میں اگر ایمان حقیقی ہے اور تصدیق قلب سے ہے تو وہ کبھی منحرف ہو ہی نہیں سکتا اس لیے اس سے ثابت قدمی کا طلب کرنا بے معنیٰ سی بات ہے۔ بہر حال آیت زیر بحث میں "الذین آمنوا" سے رسمی ایمان مراد ہے جس کے باعث وہ مسلمانوں کے زمرہ میں شامل سمجھا جاتا اور مسلمان کہلاتا ہے اور "من آمن" میں جو ایمان ہے اس سے مراد حقیقی ایمان ہے

---

[1] ایضاً

جو مدار نجات اخروی ہے اس لیے اب یہ اشکال بالکل باقی نہیں رہتا۔

رہا دوسرا سوال تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس آیت کو قرآن مجید کی دوسری آیات جو ایمان باللہ سے متعلق ہیں ان کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو سرے سے کوئی اشکال واقع نہیں ہوتا۔ قرآن میں بار بار اسی حقیقت کو نہایت وضاحت سے اور مختلف اسالیب بیان میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ دین حضرت آدم سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی ہے۔ فرق صرف شرائع اور مناہج کا ہے اور شریعت لاحقہ بہ نسبت شریعت سابقہ و متقدمہ کے زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ اس بنا پر ایک شریعت کے بعد جب کوئی دوسری شریعت آجائے تو اب معمول بہ دوسری شریعت ہوگی نہ کہ پہلی۔ اس نظام اور ترتیب کے مطابق شریعت موسوی یہود کے لیے اسی وقت تک واجب العمل تھی جب تک شریعت عیسوی نہیں اُتری تھی جب وہ آگئی تو اب اس پر عمل کرنا اور حضرت عیسیٰ پر ایمان لانا ضروری ہوگیا۔ اسی طرح شریعت عیسوی کے بعد جب شریعت محمدی آگئی تو اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور آپ کی شریعت پر عمل کرنا ضروری ہوگیا۔ چونکہ دعوت محمدی جو عالمگیر و ہمہ گیر ہے اس کی بنیاد دین اور شریعت کا یہ نظام ہی ہے اس بنا پر قرآن نے اس کو بڑی خوبی اور بلاغت سے جگہ جگہ بیان کیا ہے، اور ان لوگوں کی سخت مذمت کی ہے جو دین میں اور انبیا میں تفریق کرتے ہیں، یعنی ایک کو مانتے ہیں اور ایک کو نہیں مانتے، کسی کا اقرار کرتے ہیں اور کسی کا انکار۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر اور قرآن آخری کتاب الٰہی ہے۔ اب خواہ کوئی یہودی ہو یا نصرانی، صابی ہو یا مجوسی بہر حال نجات اخروی کے لیے ان دونوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ سورۂ البقرہ میں ہے:

واذا قیل لھم آمنوا بما انزل اللہ قالوا نؤمن بما انزل علینا و یکفرون بما وراءہ وھو الحق مصدقاً لما معھم ط

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے (اب) جو کتاب نازل کی ہے اس پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں ہم پر جو کتاب نازل ہو چکی ہے ہم تو اس پر ایمان لائے ہیں اور ان کی کتاب کے بعد جو کتاب نازل ہوئی ہے اس کو وہ نہیں مانیں گے حالانکہ یہ کتاب

سراسر حق ہے اور جو کتاب ان کے پاس ہے اس
کی تصدیق کرنے والی بھی ہے۔

پس یہ آیت اور اس سلسلہ کی دوسری آیات، بلکہ سچ یہ ہے کہ پورے قرآن سے ہی یہ بات بالکل صاف اور ظاہر ہے کہ قرآن جہاں کہیں فقط ایمان کی یا ایمان باللہ کی یا ایمان باللہ والیوم الآخر کی دعوت دیتا ہے اس کی مراد ایمان کا وہ جامع تصور ہوتا ہے جس میں محمد رسول اللہ اور قرآن پر ایمان لانا شرط اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب زیر بحث آیت پڑھیے تو مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے اور کسی قسم کا کوئی گنجلک باقی نہیں رہتا۔ یعنی یہ کہ رسمی مسلمان ہو یا یہودی یا عیسائی یا صابی، اس میں سے جو بھی سچ مچ (قرآن کی تعلیمات کے مطابق) اللہ اور یوم الآخر پر ایمان لے آئے گا اور عمل صالح کرے گا اس کے لیے اللہ کے پاس اس کا اجر ہوگا۔[1]

صابئین کون ہیں؟

---

[1] لیکن افسوس ہے مفسرین نے اپنی عادت کے مطابق اس آیت کی تفسیر بھی اس طرح کی ہے کہ بات کچھ الجھ ہی جاتی ہے، مثلاً طبری نے حضرت عبداللہ بن عباس کا ایک اثر نقل کیا ہے کہ انھوں نے پہلے آیت زیر بحث "ولاہم یحزنون" تک تلاوت کی اور فرمایا اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ دوسری آیت نازل کی "ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وہو فی الاخرۃ من الخاسرین" (سورہ آل عمران: ۸۵) اس اثر کو نقل کرنے کے بعد طبری لکھتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے عبداللہ ابن عباس کی رائے یہی تھی کہ اس آیت میں اللہ نے پہلے وعدہ کیا تھا کہ یہود، نصاریٰ اور صابی ان میں سے جو بھی عمل صالح کرے گا (اسلام کو قبول کیے بغیر اللہ آخرت میں اس کو جنت عطا فرمائے گا لیکن اس کے بعد "ومن یبتغ" والی آیت نازل فرما کر اس آیت کو منسوخ کر دیا نیز اس موقع پر طبری نے مشہور تابعی مفسر سدی سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں موصوف حضرت سلمان فارسی کے قبول اسلام کا واقعہ نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت سلمان نے خود مسلمان ہو جانے کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ان ساتھیوں کی نسبت دریافت کیا جنھیں وہ بیت المقدس کے گرجا میں چھوڑ کر آئے تھے اور کہا حضور! یہ میرے ساتھی روزہ رکھتے اور نماز پڑھتے تھے اور آپ پر (غائبانہ) ایمان لائے ہوئے تھے (بقیہ صفحہ ۶ پر دیکھیے)

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ صابئون کون لوگ مراد ہیں ؟ افسوس ہے اس بارے میں بھی مفسرین کے اقوال اتنے ہیں کہ کسی ایک نتیجہ پر پہنچنا آسان نہیں ہے ۔ چنانچہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں ۔

مفسرین کے آراء :

" صابئون جمع صابی کی ہے اور صابی اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنا دین ترک کر کے کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کیونکہ وہ آپ کے مبعوث ہونے کی گواہی دیتے تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " یہ لوگ دوزخی ہیں " سلمان کو یہ سن کر بڑا دکھ ہوا اور عرض کیا " اگر یہ لوگ آپ کی بعثت کا زمانہ پالیتے تو بے شبہ وہ آپ کی تصدیق کرتے اور آپ کے پیرو ہوتے " اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔ اس کے بعد طبری نے مجاہد سے بھی ایک روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہی ہے البتہ اتنی بات زائد ہے کہ جب آیت نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسی کو بلایا اور فرمایا " تمھارے ساتھیوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے " اور اس کے بعد مزید فرمایا " جو شخص میری دعوت سننے سے پہلے دین عیسیٰ اور اسلام پر مرا وہ اچھی حالت میں ہے مگر جس شخص نے میری دعوت کو سنا اور مجھ پر ایمان نہیں لایا وہ ہلاک ہوا " (جلد ۱۲ صفحہ ۱۵۰ تا صفحہ ۱۵۵) لیکن احمد محمد شاکر جنھوں نے طبری کی احادیث کی تخریج کی اور ان پر حواشی لکھے ہیں مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کو منقطع بتاتے ہیں اس لیے ظاہر ہے ان پر اعتماد نہیں ہو سکتا ۔ لیکن اگر دونوں روایتوں کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اب تین اعتراض وارد ہوتے ہیں ایک یہ کہ جب معاملہ ان لوگوں کا تھا جن کو دعوتِ محمدی نہیں ملی اور ان کا خاتمہ اپنے مذہب کے مطابق ایمان اور عمل صالح پر ہوا تو آیت میں ان کے ساتھ ان لوگوں کو کیونکر ذکر کیا ہے جن کو دعوتِ محمدی پہنچی اور انھوں نے اسے قبول کیا ۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ آیت کے مضمون کو دو سورتوں " البقرہ اور المائدہ " میں بیان کیا گیا ہے ۔ حضرت سلمان فارسی کے سوال کا جواب ایک آیت سے ہو جاتا ہے ۔ پھر اس کی تکرار کی وجہ کیا ہے ؟ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ جن لوگوں کو دعوت محمدی نہیں پہنچی اور ان کا خاتمہ اپنے مذہب کے مطابق ایمان باللہ اور عمل صالح پر ہوا آخرت میں ان کی مغفرت کا معاملہ تو بالکل واضح تھا ۔ پھر حضور کا یہ فرمانا کہ وہ دوزخی ہیں کس پر محمول کیا جائے گا ؟

اور دوسرا دین اختیار کرلے۔ مثلاً وہ شخص جو اسلام سے مرتد ہو جائے۔ عرب ہر ایسے شخص کو صابی کہتے تھے۔ اب اختلاف اس بات میں ہے کہ آیت میں جن لوگوں کو صابئون کہا گیا ہے وہ کون ہیں؟ بعض کہتے ہیں "اس کا مصداق وہ تمام لوگ ہیں جو ایک دین کو ترک کرکے کوئی اور دین اختیار کرلیں۔" اس کے برخلاف بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا کوئی دین نہیں۔ مشہور مفسر مجاہد سے مروی ہے کہ صابئون نہ یہود ہیں اور نہ نصاریٰ اور ان کا کوئی دین نہیں ہے۔ مجاہد سے ایک دوسری روایت حجاج بن ارطاۃ کی یہ ہے کہ صابئون مجوس اور یہود کے درمیان ایک طبقہ کا نام ہے، نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ حسن بصری اور ابن ابی نجیح سے بھی یہی مروی ہے لیکن ابن زید کی رائے یہ ہے کہ "جزیرۂ موصل میں کچھ لوگ آباد تھے جو کسی دین کو مانتے تھے اور لا الٰہ الا اللہ کہتے تھے مگر ان کے پاس نہ کوئی عمل ہے اور نہ یہ کسی پیغمبر یا کتاب کو مانتے ہیں۔" چند مفسرین کی رائے ہے کہ یہ لوگ فرشتوں کی پوجا کرتے اور قبلہ کی طرف نماز پڑھتے تھے۔ زیاد بن ابیہ جو حضرت امیر معاویہ کے زمانے میں عراق کا گورنر تھا اس نے یہ دیکھ کر کہ یہ لوگ قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں ان سے جزیہ ساقط کر دینے کا ارادہ کرلیا تھا مگر پھر اسے بتایا گیا کہ فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ قتادہ جو مشہور مفسر ہیں ان سے بھی یہی قول مروی ہے مگر اس میں اتنی بات زیادہ ہے کہ "یہ لوگ زبور کی بھی تلاوت کرتے تھے۔" ابو العالیہ کی رائے ہے کہ یہ لوگ اہل کتاب تھے اور زبور کی تلاوت کرتے تھے۔ ابو جعفر الرازی سے بھی یہی منقول ہے۔ سدی سے کسی نے پوچھا تو جواب دیا "یہ لوگ اہل کتاب میں سے ہیں۔"[1]

بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ صابئہ دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو صابئہ حنفاء کہلاتے اور دوسرے مشرکین تھے۔ یہ دوسرا طبقہ ستارہ پرست تھا اور یہود و نصاریٰ کی طرح ان کے بھی عبادت خانے ہوتے تھے۔ مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لفظ صبا یصبا صبأ سے مشتق ہے جس کے معنی مائل و راغب ہونے کے ہیں۔ اسی مناسبت سے طلوع

---

[1] طبری ج ۲ ص ۱۴۵ تا ۱۴۷

کرنے کے معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں "صبأت النجوم" یا "صبأ علینا فلان" بمعنی طلعت وطلع۔ اور طلوع کے معنی میں چونکہ خروج کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے جو شخص اپنا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار کرلیتا تھا، اسے صابی کہتے تھے۔ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو "الصباۃ" کہتے تھے اور اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان لوگوں کے خیال میں آپ نے اور صحابہ نے اپنا دین ترک کر دیا تھا۔ بنو جذیمہ جب مسلمان ہو گئے تو کہتے تھے "صبأنا صبأنا"[1] بعض حضرات کا خیال ہے کہ صابی حضرت نوح کے دین کے پیرو تھے۔[2] بعض حضرات نے اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ان لوگوں کو حضرت نوح کے چچا صابی کے ساتھ نسبت تھی اس لیے یہ بھی صابی کہلانے لگے اور نیز یہ کہ "صابی" عجمی زبان کا اسم علم ہے۔[3]

مورخین اور دیگر حضرات:

اب مفسرین کے علاوہ مورخین اور دوسرے علما اور مصنفین کے بیانات کو دیکھا جائے تو اگرچہ انھوں نے بعض نئی باتیں کہی ہیں مگر اختلاف اور تردد و تذبذب یہاں بھی ہے اور اس بنا پر کسی قطعی نتیجہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ شاہ فارس طہمورث کے اوائل عہد حکومت میں جب لوگ عام طور پر بت پرستی اور کواکب پرستی میں مبتلا تھے، بوداسف نامی ایک شخص ارض ہند میں ظاہر ہوا اور یہ ہندی ہی تھا بھی۔ اس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا اور کہا کہ میں خدا کا فرستادہ اور اس کے بندوں اور اس کے درمیان ایک واسطہ ہوں۔ یہ بوداسف پہلا شخص ہے جس نے صابئہ طور طریق کی بنیاد ڈالی ہے۔[4]

آگے چل کر لکھتا ہے "حرانی صابئہ کے مختلف ہیکل (عبادت خانہ) تھے جو عقل اول

---

[1] النہایہ ج ۲ ص ۲۴۸

[2] لسان العرب ج ۱ لفظ صبأ

[3] تاج العروس ج ۱ ص ۸۰ و تاریخ ابن خلدون ج ۵ ص ۲۰

[4] مروج الذہب مطبوعہ مصر ۱۹۵۸ء جلد دوم ص ۲۳۰

[5] حران صوبۂ جزیرہ کا بہت قدیم اور مشہور شہر تھا تیرھویں صدی عیسوی کے ختم تک آباد رہا مشہور مورخ ابوالفدا متوفی ۱۳۳۲ء کے عہد میں ویران ہو گیا۔ اب اس جگہ ایک معمولی سا گاؤں ہے جہاں عہد قدیم کی عمارتوں کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔

اور مختلف اجرام علویہ و طبعیہ کے نام یہ ہوتے تھے[1]۔ مشہور طبیب ابوبکر محمد بن زکریا رازی نے حرانی صابئوں کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی۔ مسعودی کا بیان ہے کہ اس نے یہ کتاب پڑھی تھی اور اس میں اُن لوگوں کی نسبت ایسی ایسی باتیں درج ہیں جنھیں بیان کرنا بھی بہت سے لوگوں کو بُرا معلوم ہوگا۔ حرانی صابئہ کے مقابلے میں انھیں کا دوسرا گروہ ہے۔ مسعودی نے اس کا نام کیماریون بتایا ہے[2]۔

مسعودی نے جو بات کہی ہے بعض مورخین نے اسی کو اُلٹ پلٹ کر یا کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ کہا ہے۔ چنانچہ ابوریحان البیرونی (ولادت ۳۶۲ھ) نے "الآثار الباقیہ" میں "مدعیان نبوت" کے عنوان سے ایک باب باندھا ہے۔ اس کے تحت لکھتا ہے کہ ان مدعیان نبوت میں پہلا شخص بوداسف ہے۔ یہ بادشاہ طہمورث کی حکومت میں پہلے سال ہند میں ظاہر ہوا اور لوگوں کو ملت صابئہ کی دعوت دی۔ اس دعوت کو بہت سے لوگوں نے قبول کیا۔ اب انھیں لوگوں کے بچے کھچے جو حران میں پائے جاتے ہیں اس مقام کی نسبت سے حرانی کہلاتے ہیں[3]۔ ان لوگوں کا مسلک کیا تھا؟ اس سلسلہ میں بیرونی نے پہلے دوسرے لوگوں کے بیانات نقل کیے ہیں، جن میں اس فرقہ کی طرف بعض نہایت فحش اور گندی باتیں منسوب کی گئی ہیں اور پھر خود اپنی معلومات کی روشنی میں کہتا ہے :-

"مگر ہم تو ان کی بابت یہی جانتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کی توحید کے قائل ہیں۔ اس کو قبائح سے منزہ مانتے ہیں اور ان کے ہاں جتنے صفات باری ہیں وہ سلبی ہیں ایجابی نہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اللہ کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ وہ نظر نہیں آسکتا۔ وہ ظلم نہیں کرتا اور نہ اس پر کوئی ظلم کرسکتا ہے۔ یہ لوگ باریتعالیٰ کے لیے اسماء حسنیٰ ثابت کرتے ہیں مگر مجازاً، کیونکہ ان کے نزدیک باریتعالیٰ کے لیے درحقیقت کوئی صفت نہیں ہے۔ عالم میں جو کچھ تغیرات و تبدلات

---

[1] مروج الذہب ج ۲ ص ۲۴۷

[2] مروج الذہب ج ۲ ص ۲۵۰

[3] مطبوعہ لپزگ ۱۸۷۸ء ص ۲۰۴ و ۲۰۵

ہوتے رہتے ہیں یہ لوگ ان کو آسمان اور اجرام علویہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

جامع دمشق میں مقصورہ کے قریب محراب کے اوپر جو گنبد بنا ہوا ہے وہ انھیں کے آثار میں سے ہے۔ جس زمانے میں یونانی اور رومی مذہب صابئہ کے پیرو تھے اس زمانہ میں یہ ان کا عبادت گاہ تھا۔ جب یہود کا زور ہوا تو انھوں نے اس کو اپنا عبادت خانہ بنا لیا۔ پھر نصاریٰ کا عہد آیا تو یہ عمارت گرجا میں اور آخر میں اسلام آیا تو یہ مسجد کی شکل میں منتقل ہو گئی[51]

شہرستانی (المتوفی ۵۴۸ھ) نے یوذاسف کا نام تو نہیں لیا، لیکن یہ ضرور لکھا ہے کہ صابئہ فرقہ طہمورث کی حکومت کے پہلے سال میں ظاہر ہوا[52]۔ مگر اس فرقہ کے عقائد و اعمال کیا ہیں؟ اس کے متعلق شہرستانی نے بھی کوئی قطعی بات نہیں کہی۔ مختلف اقوال نقل کر دیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ صابئہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو کسی کتاب کو نہیں مانتے لیکن حدود و احکام (یعنی حلال و حرام) کے قائل ہیں[53]۔ ایک مقام پر یہ لکھتے ہیں "حنیفیت صبوہ کے مقابل ہے"[54] آگے چل کر اس قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں "صابئہ کو عالم ارواح و مجردات میں زیادہ یقین ہوتا ہے۔ اور اس کے برخلاف حنفا کا اعتقاد جسمانی بشر (یعنی انبیا و رسل) میں ہوتا ہے[55]۔ حنفا اور صابئوں میں یہ بنیادی سبب اختلاف بتانے کے بعد شہرستانی نے تقریباً تیس صفحوں میں ان ان دونوں فرقوں کے مناظرے نقل کیے ہیں جو بڑے دلچسپ بھی ہیں اور معلومات افزا بھی۔ ان سب سے قطع نظر ایک مقام پر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "اہل ہند میں کچھ لوگ ملّت

---

[51] الآثار الباقیہ ۱۸۷۸ء ص ۲۰۵

[52] کتاب الملل والنحل مطبوعہ لیزگ ۱۹۲۳ء جلد ۲، ص ۱۸۵

[53] ایضاً جلد اول ص ۲۴ و جلد دوم ۲۰۲

[54] ایضاً، جلد اول، ص ۲۰۹، جلد دوم، ص ۲۰۳

[55] ایضاً، جلد ۲، ص ۲۰۳

ابراہیمی کے قائل ہیں اور ان میں اکثر مذہب صابئہ رکھتے ہیں۔[1]"

اصل یہ ہے کہ قدیم اسلامی مورخین میں یہ مشہور ہے کہ ہندوستان کے برہمن چونکہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب[2] کرتے ہیں اس لیے وہ برہمن کہلاتے ہیں اور یہ کچھ مسلمان مورخین کے ساتھ مخصوص نہیں ہندوؤں میں بھی اس خیال کے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ چنانچہ دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ ہندی وسنسکرت مہامہو پادھیا پنڈت لکشمی دھر نے عرصہ ہوا اورنٹیل کانفرنس کے کسی ایک سیشن میں ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں انھوں نے یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ حضرت ابراہیم جنوبی ہند کے کسی مقام پر پیدا ہوئے تھے اور دراوڑ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بہرحال شہرستانی نے جو آخری قول نقل کیا ہے اس میں ہمارے نزدیک ملت ابراہیمی کے قائل جن لوگوں کو کہا گیا ہے ان سے مراد برہمن ہیں جس کی جمع عربی میں براہمہ آتی ہے اور جن لوگوں کو مذہب صابئہ کا پیرو بتایا گیا ہے وہ بدھسٹ (بوداسف یعنی گوتم بدھ کے پیرو) ہیں۔

بوداسف کون ہے؟

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے عرب مورخین کی عام رائے یہ ہے کہ فرقۂ صابئہ کی داغ بیل بوداسف نے ڈالی تھی اور وہ ہندی تھا۔ لیکن یہ بوداسف ہے کون؟ اگرچہ البیرونی نے ایک ضعیف قول یہ نقل کیا ہے کہ بوداسف سے مراد ہرمس ہے مگر خود ہرمس کی شخصیت مختلف فیہ ہے بعضوں کے نزدیک ہرمس حضرت ادریس کا نام ہے جن کو توراۃ اخنوخ کہا گیا ہے اور بعض حضرات کا خیال تھا کہ یونان کا ایک بڑا فلسفی تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب جب بوداسف بولتے ہیں تو ان سے مراد گوتم بدھ ہی ہوتا ہے اگرچہ گوتم بدھ کے لیے کبھی بُدّ یا بدھ کے الفاظ کے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے[3] بوداسف براہ راست بدھا کی تعریب نہیں ہے۔ بلکہ بودھی ست

---

[1] کتاب الملل والنحل مطبوعہ لیبزگ جلد ۲، ص ۴۴۴

[2] الآثار الباقیۃ ۲۰۶

[3] قدیم ایڈیشن ج ۱ ص ۷۷۰، لفظ بدھ

کا معرب ہے۔ یہ پالی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں "علم و معرفت کے اعلیٰ مقام پر پہنچنے والی ہستی"۔ لوگ اعزاز و اکرام کے طور پر گوتم بدھ کو بدھی ست (BODHISATTVA) کہتے تھے۔ اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جہاں تک عرب مورخین کا تعلق ہے ان کا عام رجحان یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں جن کو صابئون کہا گیا ہے وہ گوتم بدھ کے پیرو یعنی بدھ ہیں۔

ہمارے زمانہ میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی رائے بھی یہی تھی۔ چنانچہ مولانا نے "معارف" اعظم گڑھ کی دو اشاعتوں (فروری و مارچ ۵۳ء) میں ایک مقالہ اسی موضوع پر لکھا تھا اور اس میں اپنے مخصوص انداز تحریر میں یہی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ صابئہ اور بدھ ایک ہیں۔ ان کے جواب میں مولانا مرحوم کے ہی رفیق کار مولانا سید فضل اللہ نے اگست ۵۳ء کے "معارف" میں ایک مقالہ شایع کیا جس میں مولانا گیلانی کے نظریہ یا تحقیق کی تردید کرتے ہوئے بوداسف کے بدھا ہونے سے انکار کیا گیا تھا۔

اصل یہ ہے۔ جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام[1] کے مقالہ نگار نے لکھا ہے۔ عرب مورخین گوتم بدھ اور ان کی تعلیمات سے باخبر تو ہیں لیکن گوتم بدھ کا عہد کونسا تھا؟ اس بارے میں ان کی معلومات بہت ناقص ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ عرب مورخین کا کیا قصور! جب خود بودھی مت کے علما ہزار کوشش کے باوجود اس سلسلے میں کوئی قطعی اور متفقہ بات نہیں کہہ سکے۔ اب آخری تحقیق یہ ہے کہ گوتم بدھ کی پیدائش حضرت عیسیٰ سے پانچسو ساٹھ برس پہلے ہوئی تھی۔ بہرحال عربوں کو نہ بدھا کے عہد کا صحیح علم تھا اور نہ وہ ان کی تعلیمات سے صحیح طور پر واقف تھے۔ چنانچہ شہرستانی جس کی بودھی مت سے واقفیت "الہند" کے مصنف بیرونی سے بھی زیادہ ہے۔ اس تک نے لکھا ہے کہ سب سے پہلا بدھا جو دنیا میں ظاہر ہوا، اس کے ظہور اور ہجرت نبوی میں پانچ ہزار برس کی مدت کا فاصلہ ہے[2]۔ شہرستانی نے اس بدھا کا نام شاکمین بتایا ہے جو گوتم کے لقب سکیا مونی" (SAKYAMUNI) کی عربی شکل ہے[3]۔

---

[1] جلد اول ص ۷۷۔

[2] الملل والنحل ج ۳ ص ۴۷

[3] انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس ج ۲ ص ۸۸۱

اس کے بعد شہرستانی کا بیان ہے کہ ایک اور بدھا ہوا جس کا نام بودیسعیہ تھا۔ یہ بودیسعیہ اسی لفظ بوداست کی تعریب ہے جس کو ہم اوپر لکھ آئے ہیں اور یہ دراصل کسی اور بدھا کا نہیں بلکہ خود گوتم بدھ کا لقب تھا۔ بہر حال اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ عرب مورخین کی معلومات اس معاملہ میں کس درجہ ناقص اور غلط ہیں۔ اس بنا پر اگران مورخین نے ایران کے پیشدادی خاندان کے بادشاہ طہمورث خود جس کی زندگی ایک افسانہ ہے اس کی حکومت کے پہلے سال میں "بوداسف" کا ظہور بتادیا ہے، تو محض اس سے یہ نتیجہ نکالنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ "بوداسف" بدھا کے علاوہ کوئی اور دوسرا شخص ہے۔ حق یہ ہے کہ عرب مورخین کے نزدیک بوداسف سے مراد مہاتما گوتم بدھ ہیں اور وہی ان کے خیال میں فرقۂ صابیۂ کے بانی ہیں۔

عام ارباب تفسیر ہوں یا ارباب تاریخ کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ خود قرآن مجید سے صابیوں کی کن خصوصیات و اوصاف پر روشنی پڑتی ہے۔ ورنہ اختلافات و تنوع آرا کا دائرہ ہرگز اس قدر وسیع نہیں ہوسکتا تھا اور نہ اس فرقہ کی تعیین کے سلسلے میں کوئی ایسی بات بابت سے نکلتی جس کی تردید قرآن سے ہوتی ہے۔ اور واقعی ایک فاضل مستشرق کے بقول یہ امر کچھ کم افسوسناک نہیں ہے کہ قرآن میں جس فرقہ کا ذکر مسلمانوں اور مشہور اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے پہلو بہ پہلو کیا گیا تھا۔ ارباب تفسیر و تاریخ اس کی صحیح اور قطعی نشاندھی سے قاصر رہے ہیں[1]۔

صابیوں کی خصوصیات قرآن کی روشنی میں:

قرآن میں اس فرقہ کا ذکر تین جگہ آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۶۲، المائدۃ آیت ۶۹ اور الحج آیت ۱۷ میں۔ ان تینوں مقامات کو یکجائی طور پر پیش نظر رکھا جائے تو حسب ذیل نتائج صاف طور پر نکلتے ہیں۔

(۱) صابیۂ مشرک نہیں تھے، کیونکہ سورۃ الحج میں ان کو مشرکین کے بالمقابل ایک قسم کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے:۔

---

1. THE FOREIGN VOCABULARY OF THE QURAN BY ARTHUR JAFFREY P. 3

ان الذین آمنوا والذین ھادوا والصابئین والنصریٰ والمجوس والذین اشرکوا ان اللہ یفصل بینھم یوم القیامۃ ان اللہ علی کل شیٍٔ شھید

بے شبہ مومن، یہود، صابی، نصاریٰ، مجوسی اور مشرک، اللہ قیامت کے دن ان میں امتیاز کرے گا۔ بے شبہ اللہ ہر چیز کا دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں یہ بات بھی لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ صابیین کو ترتیب میں تیسرے نمبر پر یعنی نصاریٰ سے بھی پہلے رکھا گیا ہے۔

(۲) صابی اہلِ کتاب تھے، کیونکہ مشرکین کے علاوہ جتنے لوگ باقی رہ جاتے ہیں وہ سب "وما من امۃ الا خلا فیھا نذیر" کے ارشاد کے مطابق اہلِ کتاب ہیں اس بات کا قوی قرینہ یہ بھی ہے کہ ان کو اہلِ کتاب کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کا اہلِ کتاب ہونا تو ظاہر ہی ہے، مجوس کے ساتھ بھی حضرت عمرؓ نے اہلِ کتاب کا معاملہ کیا ہے[1]۔ علاوہ ازیں سورۂ البقرۃ اور سورۂ المائدہ کی آیتوں کا سیاق بتا رہا ہے کہ "من آمن باللہ" سے پہلے جو چار طبقات بشمول صابۂ بیان کیے گئے ہیں وہ کسی دین سماوی کسی نہ کسی شکل میں پیرو ہیں اور اس لیے ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر ان سے متوقع ہیں۔

(۳) معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے اس بنا پر ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صابۂ ایک مستقل بالذات اور ممتاز فرقہ تھا۔ یہ نہیں تھا جیسا کہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ وہ یہود یا نصاریٰ کی ایک شاخ ہوں۔

ان تنقیحات کی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو مندرجہ ذیل اقوال و آرا جو آپ اوپر پڑھ چکے ہیں قرآن سے خود بخود ان کی تردید ہو جاتی ہے:

(الف) صابۂ کا کوئی دین نہیں تھا۔

(ب) یہ لوگ مشرک تھے اور فرشتوں و ارواح وغیرہ کی عبادت کرتے تھے۔

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۶۶ یوم جلولا و الوقیعہ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے حضرت عمر سے حضور کا ارشاد نقل کیا تھا

(ج) صابئون ان سب لوگوں کو کہتے ہیں جو ایک دین ترک کرکے کوئی دوسرا دین اختیار کرلیں۔

(د) صابئہ دو قسم تھے۔ ایک حنفا اور دوسرے مشرکین۔ اس قول کی تردید کی وجہ یہ ہے کہ جو فرقہ اصلاً اہل دین یا اہل کتاب کی حیثیت سے معروف ہوجاتا ہے اس کے کچھ افراد اگر مشرکانہ اعمال وافعال کرنے بھی لگیں تو اس سے فرقہ کی دو قسمیں نہیں ہوجاتیں۔ جب تک کہ وہ لوگ اس فرقہ سے اپنا تعلق منقطع کرنے کا اعلان نہیں کرتے فرقہ کی اعتبار سے غیر مشرک ہی کہلائیں گے۔

صابئہ بودھ مت کے پیرو نہیں ہوسکتے :۔

مذکورہ بالا اقوال مفسرین کے تھے۔ اب مورخین کا قول یعنی یہ کہ بودھ مذہب کے پیرو صابئہ ہیں، اس پر غور کیا جائے تو قرآن سے صاف طور پر اس کی تردید بھی ہوجاتی ہے۔ اور اس کے وجوہ یہ ہیں ۔

(۱) گوتم بدھ کے یہاں نہ خدا کا تصور ہے اور نہ یوم آخرت کا اور اس بنا پر پیغمبری کا بھی اس مذہب میں کوئی تصور نہیں۔

(۲) گوتم بدھ کے مذہب کو قرآن کی اصطلاح کے مطابق ہم دین نہیں کہہ سکتے۔

(۳) گوتم بدھ اور ان کے پیرووں کے متعلق عرب مورخین کا یہ بیان غلط ہے کہ گوتم بدھ نے پیغمبری کا دعوی کیا تھا۔ اور یہ لوگ توحید کے قائل تھے۔

(۴) عرب مورخین لکھتے ہیں کہ صابئہ تین وقت کی نماز مسلمانوں کی طرح پڑھتے تھے۔ ان کے ہاں حلال وحرام کے احکام بھی مسلمانوں کے احکام سے ملتے جلتے تھے[1]۔ اگر مورخین کے مطابق یہ صابئہ کی صحیح تصویر ہے تو اس کا مصداق بودھ نہیں ہوسکتے کیونکہ ان کے ہاں نہ قبلہ و نماز کا پتہ کا اور نہ ان کے احکام مسلمانوں کے احکام سے مماثلت رکھتے ہیں۔
مسعودی نے ابو بکر محمد بن زکریا الرازی کی ایک کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جسے مسعودی

---

[1] حوالہ کے لیے دیکھیے مسعودی۔ شہرستانی اور بیرونی۔

نے خود دیکھا ہے اور جس میں حرانی صابئہ کے مذاہب بیان کیے گئے ہیں[1]۔ ہمیں نہیں معلوم کہ رازی نے جو یہ مذاہب بیان کیے ہیں وہ کیا ہیں؟ البتہ خود مسعودی نے ان لوگوں کا مذہب کواکب اور جواہر عقلیہ کی پرستش بتایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رازی نے بھی یہی لکھا ہوگا۔ اگر واقعی ایسا ہے تو یہ لوگ بھی یقیناً قرآن کے صابئہ نہیں ہیں۔

عہد حاضر کے علماء نے بھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، لیکن متقدمین نے جو کچھ لکھا ہے ان حضرات نے بھی اسی کو الٹ پلٹ کر نقل کر دیا ہے چنانچہ سید محمود شکری الآلوسی اپنی فاضلانہ کتاب بلوغ الارب میں لکھتے ہیں:

"یہ لوگ حران میں تھے اور یہ مقام صابئہ کا مرکز تھا۔ ان میں دو گروہ تھے۔ ایک حنفا کا اور دوسرا مشرکین کا۔ ان میں جو مشرک تھے وہ سبعہ سیارہ اور ان کے بروج کی پرستش کرتے تھے اور ان کا ہیکل بنا کر رکھتے تھے ... ان ستاروں کی عبادت کرنے کے طریقے مختلف تھے۔ یہ ان کے بت بھی بنا کر رکھتے، ان کے نام کی قربانی کرتے اور مسلمانوں کی طرح پانچ وقت کی نماز بھی پڑھتے تھے ان میں کچھ گروہ تھے جو ماہ رمضان کا روزہ بھی رکھتے۔ کعبہ کی تعظیم کرتے اور حج کے بھی قایل تھے۔ ان کے ہاں کھانے پینے کی چیزوں میں اور نکاح کے معاملہ میں حلال و حرام کے احکام وہی تھے جو مسلمانوں کے ہاں ہیں[2]۔"

مذکورہ بالا باتیں سب وہی ہیں جو مورخین نے لکھی ہیں۔ البتہ ایک نئی بات یہ بھی لکھی گئی ہے کہ "یہ لوگ حضرت ابراہیم کی قوم اور آپ کے اہل دعوت تھے[3]"۔ لیکن اس کے بعد فاضل موصوف نے جو تفصیلات لکھی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک بھی صابئہ، یہود اور نصاریٰ اور مجوس کی طرح کسی ایک خاص فرقہ کا نام نہیں ہے جس کے مخصوص عقائد و اعمال ہوں۔ بلکہ صابئہ مختلف فرقوں اور گروہوں کا نام ہے جن کے درمیان اختلاف عقائد و افکار کے باوصف صرف

---

[1] مروج الذہب جلد ۲ ص ۲۵۰

[2] بلوغ الأرب جلد دوم ص ۲۲۴

[3] بلوغ الأرب جلد دوم ص ۲۲۴

ایک مشترک امر یہ ہے کہ یہ لوگ کسی ایک خاص دین اور مذہب کے پابند نہیں ہیں جس کسی مذہب اور مسلک دین میں انھیں کوئی اچھی بات نظر آئی ہے اسے قولاً و عملاً اختیار کر لیتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کا نام صابئہ ہے[1] چنانچہ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد موصوف کہتے ہیں: "غرض کہ صابئہ کے بہت سے فرقے اور گروہ ہیں۔ ایک فرقہ حنفا کا اور دوسرا مشرکوں کا تیسرا فلاسفہ کا اور ایک فرقہ بالکل آزاد لوگوں کا۔ یہ سب لوگ عجیب معجون مرکب ہیں۔ ان میں کوئی نبوت کا قائل ہے اور کوئی منکر۔ کوئی توحید کو مانتا ہے اور کوئی مشرک ہے۔" جیسا کہ ہم اوپر بتا آئے ہیں قرآن میں جن لوگوں کو صابئہ کہا گیا ہے وہ یہود اور نصاریٰ کی طرح ایک مستقل فرقہ ہیں اور اہل کتاب ہیں اس لیے آلوسی جن کو صابئہ کہتے ہیں وہ یقیناً قرآن کے صابئہ نہیں ہیں۔

مستشرقین:-

مستشرقین نے بھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور بعض نے تو اس پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جوِلسن (CHWOLSAN) نے جرمنی زبان میں "فرقہ صابیہ اور صابیت" (DIE SCABIER UND DER SCABISMUS) کے نام سے ایک کتاب ۱۸۵۶ء میں لکھی۔ یہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری ہے۔ لیکن یہ کس پایہ اور مرتبہ کی کتاب ہے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جھوس پیڈرسن (JOHS PEDERSEN) جس نے خود صابیہ پر ایک فاضلانہ مقالہ لکھا ہے جوِلسن کی کتاب کے متعلق لکھتا ہے "یہ کتاب اس موضوع پر بنیادی سے زیادہ ہے اور اس میں مصنف نے اپنا جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے اس مضمون کے طلباء میں اب تک وہی مقبول ہے۔[2] اس کتاب میں کیا ہے؟ اسے بھی موصوف کی زبان سے سنیے۔ لکھتے ہیں:-

جوِلسن کی تحقیقات کے نتائج حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب "روغنا فقین" (REFUTATION OF HERESIUS) (جو موجودہ تحقیقات کی

---

[1] بلوغ الارب ج ۲ ص ۲۲۵

[2] عجب نامہ ص ۳۸۲

روشنی میں ہپولیٹس (HIPPOLYTUS) متوفی ۲۳۵ء سے منسوب کی جاتی ہے) میں بیان کیا گیا ہے کہ الخسائیٔ نام کا ایک شخص پرتھیا سے ایک کتاب لے کر آیا جس کی نسبت اس کا دعویٰ تھا کہ اس پر ایک فرشتہ نے نازل کی ہے اور اس نے وہ کتاب ایک شخص کے حوالے کی جس کا نام صوبیہ تھا۔ اس نام سے پتہ چلتا ہے کہ صابیہ اسی کی طرف منسوب تھے اور یہ صابیہ وہی ہیں جنھیں منڈنیس کہا جاتا ہے۔

(۲) اس فرقہ کی نسبت ابن ندیم فہرست میں لکھتا ہے "واسط اور بصرہ کے درمیان جو ترائی کا میدان ہے اس میں ایک فرقہ پایا گیا ہے جس کا نام المغتسلہ ہے اس فرقہ کا نام الحسیح تھا۔

(۳) یہ صابیہ (منڈنیس) وہی ہیں جن کا ذکر قرآن میں تین مقامات پر آیا ہے جیسا کہ نوربرگ (NORBERG) اور میخائیل (MICHAELIS) کا قیاس ہے۔ یہ نام آرامی زبان کے لفظ (۲/۲) سے مشتق ہے جس کے معنی غوطہ لگانا ہیں۔

(۴) پھر ان ہی لوگوں میں مانو یہ پیدا ہوئے کیونکہ مانی کا باپ فتاق جب اس کی بیوی حاملہ تھی، ان لوگوں میں آ بسا تھا۔[۵۱] غرض کہ خلاصہ یہ ہے کہ یہ صابئہ وہی ہیں جن کو عرب مورخین مغتسلہ کے نام سے جانتے ہیں اور یہی منڈنیس کہلاتے ہیں۔ منڈنیس یا عرب مورخین کے مغتسلہ قرآن کے صابیہ ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ اس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ اس سے پہلے یہ معلوم کر لیجئے کہ دوسرے مستشرقین اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر اسپرنگر نے مروج الذہب کے انگریزی ترجمہ کی جلد اول میں لکھا ہے کہ قدیم مستشرق ہوٹنگر (HOTTINGER) نے بھی اپنی کتاب (HISTORIA ORIENTALIS) کی جلد اول کے آٹھویں باب میں صابیہ مذہب سے مستقل اور مفصل بحث کی ہے۔ لیکن اس ساری بحث کا دارومدار ابن ندیم کی الفہرست ہی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر اسپرنگر کے بقول مصنف کو نہ کتاب کا نام صحیح معلوم تھا اور نہ اس کا علم تھا کہ مصنف (ابن ندیم) کس عہد سے تعلق رکھتا تھا۔[۵۲]

---

۵۱ عجیب نامہ ص ۳۸۹

۵۲ ایضاً ص ۲۱۷

رچرڈ بیل لکھتا ہے: "میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جنوبی عرب کے عیسائی جو شمالی عرب کے عیسائیوں سے جن کو نصاریٰ کہا جاتا ہے بالکل ممتاز تھے انھیں کو صابی کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ شہر سبا کے باشندے تھے اس لیے "س" "ص" سے بدل گیا اور یہ صابی کہلانے لگے لیکن موصوف کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ عربی زبان میں سین اور صاد کا فرق معمولی نہیں ہے اس لیے ایک دوسری توجیہ یہ کرتے ہیں کہ ممکن ہے اس سے مراد الکسایون ہوں جن کے بچے کھچے لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں عرب کے شمالی مغربی حصہ میں پائے جاتے تھے۔"[1]

ان توجیہات میں سے پہلی توجیہ کی رکاکت کو خود مصنف نے تسلیم کیا ہے۔ رہی دوسری توجیہ تو اس کے متعلق گذارش یہ ہے کہ الکسایون (ELKISAITS) کا فرقہ جو الکسائی نامی ایک شخص کی طرف منسوب ہے اور جو پہلی صدی عیسوی کے اواخر یا دوسری صدی کے اوائل میں وادی اردن میں ظاہر ہوا تھا اگرچہ توحید کا قائل تھا اور بتوں کے نام پہ جو جانور ذبح ہوتے تھے ان کو حرام قرار دیتا اور بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا تھا لیکن اول تو یہ فرقہ یہودیت کی ایک شاخ تھا[2]۔ اور اس کے علاوہ جس شخص کی طرف یہ منسوب ہے اسے اگرچہ خود صاحبِ کتاب ہونے کا دعویٰ تھا لیکن کسی حدیث یا کسی اثر و خبر سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پیغمبر اور اس کی کتاب کو آسمانی کتاب مانتے تھے۔ بلکہ پورے ذخیرہ احادیث و آثار میں اس کا نام تک کہیں مذکور نہیں ہے۔ اس بنا پر الکسایون کا مصداق اس فرقہ کو قرار دینا محض دور از کار اور بعید از قیاس بات ہے:

اس سلسلہ میں ڈاکٹر اسپرنگر نے ایک عجیب مضحکہ انگیز بات کہی ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یحییٰ کے تذکرہ میں ہے "وآتیناہ الحکم صبیاً"۔ ڈاکٹر اسپرنگر کی رائے یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں صحیح قرآت بجائے "صبیاً" کے "صابیًا" ہونی چاہیے۔ قرآن مجید میں اعراب بشمول الف تو بعد میں لگی ہیں اس لیے موصوف کا خیال ہے کہ اگر اصل میں لفظ "صابیًا" ہو اور بعد میں

---

[1] ORGIIN OF ISLAM IN ITS CHRISTIAN ENVIRONMENT PAGE 60.

[2] تاریخ العرب قبل الاسلام ڈاکٹر جواد علی ج ۶ ص ۸۰

وہ "صبیاً" ہوگیا ہو تو تعجب کی کوئی بات نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یحییٰ کو (JOHN THE BAPTIST) کہا جاتا ہے اور شامی زبان میں بپٹسٹ کا ترجمہ "صابی" ہے۔ یہ مطلب یہ ہے کہ جو فرقہ صابیہ کے نام سے معروف ہے وہ حضرت یحییٰ کا پیرو اور ان کی امت ہو۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے جو رائے ظاہر کی ہے وہی رائے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کرا و ڈے وو (B.CARRA DE VAUX) کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"صابیون" دو مستقل الگ الگ فرقوں کا نام ہے (۱) منڈینس (MANDEANS) یا صبیاً (LUBBAS) منڈینس یونانی زبان کا لفظ ہے اور معنی ہیں "اہل معرفت" جنھیں انگریزی میں (GNOSTICS) کہتے ہیں۔

یہ عراق کا ایک نیم یہودی اور نیم عیسائی فرقہ تھا جسے حضرت یحییٰ کا پیرو (CHIRSTIANS OF JOHN THE BAPTIST) کہا جاتا ہے۔ یہ فرقہ بپتسمہ کی رسم ادا کرتا تھا اور (۲) دوسرے حرانی یہ ایک بیدین (PAGAN) فرقہ تھا جو اسلام کے زیر سایہ عرصہ تک قائم رہا۔ قرآن میں جن صابیوں کا ذکر اہل کتاب یعنی اور نصاریٰ کے ساتھ آیا ہے اس سے بظاہر پہلا فرقہ یعنی پیروان حضرت یحییٰ مراد ہے۔ اور یہ نام عبرانی زبان کے لفظ "صبغ" (S.B.) جس کے معنی غوطہ لینا یا بپتسمہ لینا ہے اس سے بحذف العین ماخوذ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بات یہی ہے تو حرانی جو بیدین اور مشرک تھے ان کا نام صابیہ کیونکر ہوگیا؟ اس کے جواب میں موصوف کہتے ہیں "غالباً حرانیوں نے اپنے لیے یہ نام اس لیے اختیار کر لیا تھا کہ اس آڑ میں وہ مسلمانوں سے وہ مراعات حاصل کر سکیں گے جو قرآن یہود اور نصاریٰ کو اہل کتاب ہونے کی بنا پر عطا کرتا ہے"[۲]

یہ منڈینس کون لوگ ہیں؟ کہاں آباد تھے؟ ان کا مذہب کیا تھا؟ اور کیا یہ کوئی آسمانی کتاب بھی رکھتے تھے؟ مسٹر ڈبلو برانڈ (W. BRANDF) نے انسائیکلوپیڈیا آف

---

[۱] DAS LEBEN UND DIE LEHRI DES MOHAMMAD V.II. P.184

[۲] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام قدیم ایڈیشن جلد ۴ ص ۲۲

ریلیجن اینڈ ایتھکس میں ایک طویل اور فاضلانہ مقالہ لکھا ہے جس سے ان پر اور ان کے علاوہ اس سلسلہ کے دوسرے سوالات پر روشنی پڑتی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: یہ لوگ بڑے فرقوں کی حیثیت سے یا ایک منفرد خاندانی گروپ کی حیثیت سے اب سے چالیس برس پہلے تک، اور ممکن ہے اب بھی ہوں۔ فرات اور دجلہ کے نشیبی علاقوں میں اور ان دریاؤں کے کناروں پر آباد تھے جو شرقی عراق عرب اور اس سے متصل ایرانی صوبہ خوزستان کی آبیاری کرتے تھے۔ مندرجہ بالا سوالات کے متعلق جو کچھ موصوف نے لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ حضرت یحییٰ کو پیغمبر مانتے تھے اور اہل کتاب بھی تھے۔ ان کی متعدد کتابیں عیسائی مشنریوں کی کوشش سے آج کل یورپ کی لائبریریوں میں اچھی خاصی تعداد میں محفوظ ہیں ان میں اہم کتابیں دو ہیں ایک سدرا ربا (SIDRA RABBA) جس کے معنی عظیم کتاب کے ہیں اور دوسری گنزا (GENZA) پہلی کتاب ان کے عقیدہ میں وہ ہے جو حضرت یحییٰ پر نازل ہوئی تھی ان کتابوں میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں وہ مذہبی مسائل و احکام عرفانی رموز و اسرار (MYTHOLOGICAL) اخلاقی مباحث اور تاریخی واقعات سے متعلق ہیں اور ادعیہ اور اوراد و اذکار ان میں خلط ملط ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی نسبت ہمارے قدیم مورخین نے لکھا ہے کہ یہ نماز قبلہ رو ہو کر پڑھتے تھے۔ روزہ بھی رکھتے تھے۔ ختنہ کی رسم بھی ان میں رائج تھی اور اکل و شرب اور نکاح کے متعلق ان کے ہاں جو احکام و مسائل تھے وہ اسلامی احکام مسائل سے ملتے جلتے تھے۔ قرآن میں حضرت یحییٰ کا صاحب کتاب ہونا مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہے "یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ" (مریم)۔

ان امور کے پیش نظر خیال ہو سکتا ہے کہ قرآن کے صابیہ یہی لوگ ہیں لیکن اسی مقالہ نگار نے اس سلسلہ میں جو اور تفصیلات لکھی ہیں ان سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ چنانچہ (GENZA) جس کا ذکر اوپر آچکا ہے موصوف اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب کے ابواب و فصول جو غالباً سب سے زیادہ قدیم ہونے کی وجہ سے ہماری توجہ کے سب سے پہلے مستحق ہیں وہ ہیں جن میں مشرکانہ عقائد پائے جاتے ہیں یا

ء جلد ۸ ص ۳۸۰

کم از کم وہ مشرکانہ نقطۂ نظر پر مبنی ہیں ان میں سے بعض ابواب کا آغاز ان افکار و آرا سے ہوتا ہے جو دنیا کی تمام چیزوں یہاں تک کہ دیوتاؤں کی دنیا کی تخلیق سے متعلق ہیں۔ اس گروپ میں وہ تمام سیکشن (حصے) داخل ہیں جن میں مابعد الطبعیاتی عقائد بیان کئے گئے ہیں اس سلسلہ میں ثمر اعظم جس سے دوسرے بیشمار ثمر پیدا ہوئے ہیں اور اسی طرح عظمت کا مانائے اعظم جس سے دوسرے ماناؤں نے جنم لیا ان کا ذکر کیا گیا ہے اس سلسلے کی اصل عبارتوں میں معنی و مطالب کے اعتبار سے اس درجہ اختلاف ہے کہ ان سے کسی بنیادی خیال یا نقطۂ نظر کا معلوم کرنا سخت دشوار ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان میں باہمی تضاد بھی ہے اس سے اندازہ ہے کہ یہ تصورات منڈئیس علمار نے دوسرے خارجی ذرائع سے اس وقت حاصل کیے تھے جب کہ ابھی خود ان کی کتابیں نہیں لکھی گئی تھیں[1]۔

اگرچہ اس کتاب میں توحید کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ اس میں ایک نور کے بادشاہ کا ذکر ہے جس کا مقام سب سے بلند اور ارفع ہے جو تمام اجرام علویہ کا آقا اور تمام شکلوں اور صورتوں کا خالق۔ نیکی اور اچھائی کا سرچشمہ ہے اور اس کے سامنے جنت میں فرشتے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن یہ تبدیلی چوتھی یا پانچویں صدی سے ہوئی ہے[2] اس بنا پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس فرقہ کا اصل مذہب توحید تھا۔ اب رہا یوم آخرت پر ایمان جو اہل کتاب ہونے کے لیے ضروری ہے تو یہی مقالہ نگار لکھتا ہے:

"حشر کا عقیدہ تو ان لوگوں کی دینیات میں کہیں ہے ہی نہیں۔ اس بنا پر گنزا نامی کتاب میں اس کا ایک مقام پر جو حوالہ ملتا ہے وہ غالباً یہودی یا عیسائی لٹریچر سے بے پروائی کے ساتھ نقل کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کے پورے ذخیرہ ادبیات میں پتہ نہیں چلتا کہ یہ لوگ سبت مناتے تھے، ختنہ کی رسم ان میں رائج تھی۔

---

[1] جلد ۸ ص ۳۸۲

[2] جلد ۸ ص ۳۸۳

یا عبادت میں بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے[1]۔

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد موصوف کہتے ہیں کہ ان لوگوں (منڈٹیس) میں اور فرقہ مانویہ (مانی کو پیغمبر ماننے والا) میں بہت قریبی مماثلت ہے[2]۔

علاوہ ازیں ایک انگریز خاتون میسز ای۔ ایس۔ ڈراور (E, S. DRAWER) جس نے عراق اور ایران کے منڈٹیس کے درمیان کئی برس گذارنے کے بعد ان پر ایک بڑی فاضلانہ اور قابل قدر کتاب لکھی تھی، ان کی بھی رائے یہی ہے کہ ان لوگوں میں اور مانی کے پیروؤں میں بہت مشابہت ہے۔ موصوفہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عراقی گروہ حرانیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ یہ سب لوگ دراصل فرقۂ مانویہ کے ہی برگ و بار تھے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں مانوی لوگ اچھے نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے اس فرقہ سے اپنی بے تعلقی ظاہر کی ہے اور ساتھ ہی اپنی عقائد و افکار کے اظہار میں انھوں نے نو افلاطونی زبان استعمال کرنی شروع کی اور یہ سب کچھ اس غرض سے تھا کہ ان کے اصل مذہب کی کسی کو ہوا نہ لگے[3]۔

ان لوگوں کے اخفائے مذہب کا اب تک یہ عالم ہے کہ موصوفہ سے پہلے مسٹر پیٹرمین (PETEMANN) اور سوفی (SIOUFFI) ان میں کئی کئی مہینہ جاکر رہے مگر اس کے باوجود ان کی ایک مذہبی رسم تک نہیں دیکھ سکے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے یہ لوگ درحقیقت مشرک ہی تھے۔ مگر اسلام کے ابتدائی دور میں کچھ توحید کی سی باتیں کرنے لگے تھے۔ پھر ان کی کتاب میں تقیہ کی جو تعلیم ہے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کس درجے کے توحید پرست اور صاحب کتاب تھے گنزا میں لکھا ہے:

"اگر تم لوگوں پر (عیسائیوں کی طرف سے) ظلم و ستم کیا جائے تو تم کہدو کہ "ہم تو تمہارے ہی ہیں" مگر اپنے دلوں میں اس کا ہرگز اقرار نہ کرو اور نہ اپنے آقا "نور کا شاہ

---

[1] جلد ۸ ص ۲۸۵

[2] ایضاً

[3] THE MANDAEANS OF LRAG AND LRAN OXFORDR XVI

بلند" کی آواز سے سرتابی کرو. کیونکہ دروغ گو مسیح کو پوشیدہ باتوں کی خبر نہیں ہوتی"[1]
جیسا کہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے مستشرقین ان لوگوں کو عموماً حضرت یحییٰ کا متبع مانتے ہیں. مگر موصوفہ لکھتی ہیں "یہ کہنا کہ یہ لوگ بپتسمہ لیتے وقت یحییٰ (JHON THE BAPTIST) کا نام لیتے ہیں محض ایک افسانہ ہے"[2] ان لوگوں کے اہل کتاب ہونے کا یہی آخری سہارا تھا وہ بھی ختم ہوا.
بلاذری نے عراق کے حالات میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے بنو تغلب کے عیسائیوں کو اہل کتاب تسلیم نہیں کیا اور اس بنا پر ان سے جزیہ لینا منظور نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر کثیر تعداد میں دوسرے علاقوں میں جا بسے. حضرت عمر کے اس فیصلہ کی توجیہ ایک فقیہ داؤد بن گردوس نے یہ کی ہے کہ چونکہ ان لوگوں نے تصبیغ (BAPTISM) کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا ہے اس لیے ان کو اہل کتاب کی طرح ذمی قرار نہیں دیا گیا[3]. داؤد بن گردوس نے اس موقع پر ان لوگوں کے دین کے لیے معمودیہ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی (BAPTISM) ہیں[4].

مستشرقین عام طور پر کہتے ہیں کہ منڈئیس جو ان کے خیال میں درحقیقت صابیہ ہی ہیں عراق اور ایران کی سرحد پر پھیلے ہوئے تھے لیکن اگر یہ لوگ قرآن کے ایما کے مطابق واقعی صابیہ اور اہل کتاب تھے تو عراق و ایران کے فتوحات کے سلسلہ میں مورخین کے ہاں کہیں تو اس حیثیت سے ان کا ذکر آنا چاہیے تھا ہماری رائے میں فتوح البلدان میں جن کو معمودیہ کہا گیا ہے وہ یہی منڈئیس تھے اور چونکہ حضرت عمر نے ان کو اہل کتاب تسلیم نہیں کیا اس لیے یہ ثابت ہوا کہ یہ لوگ قرآن کے صابیہ نہیں تھے. امام ابوحنیفہ سے البتہ ایک روایت ہے کہ صابیہ اہل کتاب ہیں وہ ان کے ساتھ وہی معاملہ ہونا چاہیئے.

---

[1] THE MANDEANS OF LRAB AND LRAN P:15

[2] ایضاً ص ۳

[3] فتوح البلدان ص ۱۸۶

[4] LANE'S ARABIC ENGLISH LEXICON V. 6. P :215

لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ مندٔینیں جن کو مسلمانوں نے فتوحات کے زمانہ میں اہل کتاب تسلیم نہیں کیا اور اس کی وجہ سے ان کو پریشانی اٹھانی پڑی تھی انہی لوگوں نے بعد میں مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے اپنے آپ کو صابی کہنا شروع کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مورخین اور فقہا دونوں انہی لوگوں کو قرآن کا صابئہ سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ واقعہ اس کے خلاف تھا۔

ابن ندیم نے ایک عیسائی مصنف ابویوسف ایشیع القطیعی کی کتاب جو حرانیوں کے مذاہب کے بارہ میں ہے اس کے حوالہ سے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ہمارے اس قیاس کی پرزور تائید ہوتی ہے۔ چونکہ واقعہ دلچسپ ہے اور اس سے موضوع بحث کے اور گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے اس لیے ہم اسے بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔

"مامون رشید اپنے عہد خلافت کے آخری دنوں میں رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہوا تو مصر کے علاقوں سے اس کا گذر ہوا۔ یہاں اس سے بہت سے لوگ ملے جو اس کے لیے دعا کرتے تھے۔ ان لوگوں میں حرانیوں کی ایک جماعت بھی تھی یہ لانبی قبائیں پہنے ہوئے تھے اور ان کے بال بھی بڑے طول طویل تھے۔ مامون کو ان کی یہ ہئیت عجیب سی معلوم ہوئی اور اس نے پوچھا "کیا تم ذمی ہو"؟ انھوں نے جواب دیا "ہم حرانی ہیں" مامون نے کہا "کیا تم نصاریٰ ہو" یہ بولے "نہیں" مامون نے پھر پوچھا "کیا تم یہودی ہو" انھوں نے اس کا جواب بھی نفی میں دیا۔ مامون نے کہا سوال کیا "کیا تم مجوسی ہو" جب انھوں نے اس سے بھی انکار کیا تو مامون نے کہا "کیا تم کسی کتاب یا نبی کو مانتے ہو"؟ اس سوال کا جواب بھی وہ ٹھکانے سے نہیں دے سکے تو مامون نے کہا "تم لوگ زندیق یعنی بت پرست ہو۔ تم ذمیوں کے حکم میں داخل نہیں ہو سکتے" یہ بولے "ہم تو جزیہ دیتے ہیں" مامون نے جواب دیا "جزیہ تو ان لوگوں سے لیا جاتا ہے جنھوں نے اسلام قبول نہ کیا ہو اور وہ ان ادیان میں سے کسی دین کو مانتے ہوں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن) میں کیا ہے۔ ان کے پاس کوئی کتاب بھی ہو اور مسلمانوں نے اس پر ان سے مصالحت کر لی ہو تم نہ ان لوگوں میں سے ہو اور نہ ان لوگوں میں اب تمہارے لیے دو ہی راستے

ہیں یا تو اسلام قبول کرلو یا جو ادیان معروفہ ہیں ان میں سے کسی دین کے پیرو بن جاؤ۔ ورنہ میں تم سب لوگوں کو قتل کردوں گا۔ اس کے بعد مامون نے کہا کہ میں سفر میں جا رہا ہوں واپسی تک کی تم کو مہلت دیتا ہوں اس وقت تک کوئی فیصلہ کرو۔ اس گفتگو کے بعد جب مامون روانہ ہوگیا تو ان لوگوں نے اپنا لباس بدل دیا بال منڈوا دئے اور ان میں سے بہت سے لوگ عیسائی ہو گئے۔ ایک طبقہ مسلمان ہوگیا اور کچھ لوگ اپنے پرانے مذہب پر ہی قائم رہے۔ وہ سخت پریشان تھے کہ گلو خلاصی کی کیا تدبیر کریں۔ اسی اثنا میں ایک حرانی فقیہہ ان کے پاس آیا اور بولا میری سمجھ میں تمہارے لیے ایک تدبیر آئی ہے اگر تم نے اسے کرلیا تو بچ جاؤ گے۔ ان لوگوں نے اس کو بہت کچھ مال ومتاع دیا۔ اور پوچھا وہ کیا تدبیر ہے؟ فقیہہ نے کہا وہ یہ ہے جب مامون واپس آئے تو تم لوگ کہنا کہ ہم تو صابئون ہیں۔ یہ اس دین کا نام ہے جس کا ذکر اللہ نے قرآن میں کیا ہے ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور یہ اپنے آپ کو صابیون کہنے لگے۔ ادھر یہ ہوا کہ مامون کا سفر میں ہی انتقال ہوگیا۔ مگر اس وقت سے یہ لوگ صابیہ کے نام سے مشہور ہوگئے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ان میں سے جن لوگوں نے عیسائی مذہب کو قبول کرلیا تھا وہ بھی اپنے پرانے مذہب کی طرف لوٹ آئے ورنہ حران یا اس کے اطراف وجوانب میں اس وقت تک کوئی قوم ایسی آباد نہیں تھی جسے صابیہ کہا جاتا ہو۔[1]

اس واقعہ سے یہ تو بیشک ثابت ہوگیا کہ یہ لوگ جنھوں نے مامون کے آخری عہد خلافت میں (سنہ ۲۲۸ھ/ ۸۳۰ء) حکومت سے ڈر کر صابیہ کا نام اختیار کرلیا تھا، اصلی صابیہ نہیں تھے۔ لیکن اس سے اصل مسئلہ کا حل نہیں ہوتا۔ یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ قرآن میں جب اس فرقہ کا نام اس اہتمام سے آیا ہے تو یقیناً اس فرقہ کو عہد رسالت میں نہیں بلکہ

---

[1] الفہرست ص ۴۴۰

اس سے بھی پہلے سے اسی نام کے ساتھ معروف و مشہور ہونا چاہیے اور چونکہ ان آیات متعلقہ کے نزول کے بعد کسی صحابی سے یہ مروی نہیں ہے کہ انھوں نے حضور سے پوچھا ہو کہ یہ صابیہ کون ہیں؟ اس لیے معلوم ہوا کہ یہ فرقہ اسی نام سے عہد رسالت میں موجود تھا اور سب مسلمان ان کو اچھی طرح جانتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین تو غور و فکر کے بعد صحیح یا غلط صابیہ کا مصداق کسی ایک فرقہ کو متعین طور پر بتاتے بھی ہیں ہمارے عرب مورخین کے بیانات اس درجہ منتشر اور غیر مربوط ہیں کہ کسی ایک نتیجہ پر پہونچنا بڑا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر ہم مسعودی کے بیانات کو یہاں نقل کرتے ہیں۔ جو قدیم مورخ ہے۔ اس پر دوسرے مورخین کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب بیانات کتاب التنبیہ والاشراف مکتبۂ عصریہ بغداد ۱۹۳۸ء سے ماخوذ ہیں۔

(۱) شاہان روم اپنے اپنے طبقہ کے مطابق حنفا تھے اور وہی صابیون ہیں یہ اس زمانہ کی بات ہے جبکہ انھوں نے عیسائیت کو قبول نہیں کیا تھا۔ قیصر فلپس (FILLIPPOS) نے عیسائیت کو قبول کیا اور صابیہ مذہب ترک کر دیا۔ جولینس (GULIANUS) پوشیدہ طور پر صابی تھا۔ چنانچہ جب یہ تخت نشین ہوا تو اس نے عیسائیت کو خیر باد کہا اور صرف یہی نہیں بلکہ جتنے گرجا تھے سب کو منہدم کر کے ان کی جگہ تماثیل صابیہ از سر نو قائم کر دیے۔ علاوہ بریں جو لوگ پھر حنیفیت کی طرف واپس نہیں آئے ان کو موت کی سزا دی۔ جو لوگ حنیفیت کی طرف رجوع کر لیتے تھے ان کی علامت یہ تھی کہ آگ پر لوبان ڈالتے اور حنفا کے ہاتھ کے ذبیحہ قربانی کے جانور کھاتے تھے[1]

(۲) صابئین مصر وہی ہیں جن کے بچے کھچے اب حرانی ہیں۔ یہ لوگ ہرمس (HARMUS) اور آغاثاذیمون (AGATHODAIMON) جو مشہور فراعنۂ مصر ہیں ان کو پیغمبر مانتے تھے۔ مذکورۂ بالا دونو فراعنہ میں ایک ہزار برس کی مدت کا فاصلہ ہے۔ سکان مصر جو در اصل قبطی ہیں وہ ان کو پیغمبر تو مانتے تھے مگر صاحب وحی نہیں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ان دونوں کے نفوس پاک و صاف اور

---

[1] ص ۴، ۶، ۱۰۵، ۱۱۸، ۱۲۵

اس عالم کے میل کچیل سے مبرا و منزہ تھے[1]۔

(۳) گشتاسپ جس کی مدت حکومت ایکسو بیس برس ہے اس کو حکومت کرتے تیس برس ہوئے تھے کہ زردشت کا ظہور ہوا اور بادشاہ نے اس کا مذہب مجوسیت قبول کر لیا۔ سب اہل مملکت بھی مجوسی ہو گئے۔ ورنہ اس سے پہلے یہ لوگ حنفا یعنی صابئون تھے اور یہ وہی مذہب ہے جس کی تبلیغ بوداسپ نے طہمورث کو کی تھی اور یہ (صابیہ) سریانی زبان کا لفظ ہے جس کو معرب کر لیا گیا ہے اور اس کی اصل حنیفوا ہے[2]۔

(۴) اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صابئین صابی بن متوشلخ بن ادریس کی طرف منسوب ہیں۔ یہ صابی حنیفیت اولی پر قائم تھا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ لوگ صابی بن ماری سے نسبت رکھتے ہیں۔ یہ صابی حضرت ابراہیم کے عہد میں تھا[3]۔

(۵) اور سمنیہ (شمنیہ)! یہ لوگ چین کے صابئہ ہیں اور یہ اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ سب بوداسپ کے مذہب کے پیرو ہیں۔ یونان کے عوام بھی صابیہ ہیں اور یہ نماز میں رخ مشرق کی طرف کرتے ہیں، وہی صابئہ مصر جن کے بقایا حران کے صابیہ ہیں، یمن کی طرف رخ کرتے ہیں، وہی ان کا قبلہ ہے۔ یہ لوگ ان بہت سی چیزوں کو کھانا جائز نہیں جانتے جن کو یونان کے صابئہ کھاتے ہیں مثلاً خنزیر، چوزے، لہسن اور لوبیا[4]۔

مسعودی متوفی ۳۴۶ھ کے مندرجہ بالا بیانات کو دیکھ کر سخت تعجب ہوتا ہے کہ صرف یہ ہی نہیں کہ وہ صابیہ کا مصداق کسی خاص ایک گروہ کو اور ان کے مسلک و مذہب کو متعین طور پر بیان نہیں کر سکا، بلکہ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ صابیہ اور حنفاء کے متعلق خود قرآن کا کیا بیان ہے۔ مسعودی نے صابیت اور حنیفیت دونوں کو ایک دوسرے کا مرادف

---

[1] ص ۱۸، ۱۰۱

[2] ص ۶۹

[3] ص ۸۰

[4] ص ۱۳۸

اور ہم معنی بتایا ہے اور پھر صابیہ کی طرف مشرکانہ عقائد و اعمال منسوب کیے ہیں۔ اس بنا پر مطلب یہ ہوا کہ حنیفیت بھی شرک کی ایک قسم تھی، حالانکہ قرآن میں ایک دو جگہ نہیں متعدد مقامات پر حنفا اور حنیف کے الفاظ آئے ہیں اور ہر جگہ ان سے شرک کی نفی کی گئی ہے۔ مثال کے لیے آیات ذیل پر غور کیجیے :۔

(۱) حنفاء للہ غیر مشرکین بہ ط (الحج) — صرف ایک خدا کے ہو کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا کر۔

(۲) ما کان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفاً مسلماً وما کان من المشرکین (آل عمران) — ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ ایک حنیف مسلمان تھے اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔

(۳) وان اقم وجھک للدین حنیفاً ولا تکونن من المشرکین (یونس) — اور یہ کہ تو حنیف ہو کر دین پہ ثابت قدم رہ اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو۔

(۴) ان ابراھیم کان امۃً قانتاً للہ حنیفاً ولم یک من المشرکین (النحل) — بے شبہ ابراہیم ایک امام، اللہ کے فرمانبردار اور حنیف تھے اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔

(۵) ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین (النحل) — ہم نے پھر تیری طرف وحی بھیجی کہ ابراہیم جو حنیف تھے اور مشرکین میں سے نہیں اس کا اتباع کر۔

یہ اور ان کے علاوہ دوسری آیتوں سے بالکل صاف ظاہر ہے کہ حنیف مشرک کی ضد ہے۔ پھر اگر صابیت میں شرک پایا جاتا ہے تو وہ حنیفیت کے ہم معنی یا اس کے مترادف کیونکر ہو سکتی ہے۔ اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مفسرین ہوں یا عرب مورخین اور یا مستشرقین، یہ سب قرآن کے فرقہ صابیہ کا مصداق متعین کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہر ایک نے جو کچھ سنا یا پڑھا یا ذاتی طور پر تحقیق کرنے کے بعد معلوم کیا وہ لکھ دیا ہے لیکن کسی نے یہ نہیں سوچا

کہ ان کے بیان کا جامہ قرآن کے صابیہ کے قدوقامت پر بھی راست آسکتا ہے یا نہیں، اس لیے اس تمام ذخیرۂ معلومات وتفصیلات پر غور کرنے کے بعد ہم جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اب اسے بیان کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ لفظ صابی کی اصل کیا ہے؟ پہلے گذر چکا ہے کہ عام مفسرین اور مورخین کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ صبا یصبأ (مہموز اللام) یا صبا یصبو (ناقص واوی) سے ماخوذ ہے جن کے معنی علی الترتیب ترک کرنا اور مائل ہونا ہیں۔ ایک شاذ قول یہ بھی نقل کیا گیا کہ حضرت نوح کے ایک بھائی کا نام صابی تھا۔ یہ لوگ اس نسبت سے صابیہ کہلاتے ہیں محققین جدید میں سے ولہاسن (WELLHAUSEN) اور بعض اور لوگوں کی رائے ہے کہ یہ آرامی زبان کے ایک لفظ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پانی میں غوطہ لگانا ہیں۔ صابیہ چونکہ بپتسمہ لیتے تھے اس لیے ان کو صابیہ کہا جاتا تھا[1]۔ لیکن انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کا بیان ہے کہ سریانی زبان کے لوگ لفظ غنیف کا اطلاق صابیہ پر کرتے تھے[2] اس کے علاوہ مسعودی کے جو بیانات اوپر گزرے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حنفا اور صابیہ دونوں مترادف لفظوں کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔

مذکورۂ بالا سب اقوال سے (ایک کو مستثنیٰ کرکے) یہ ظاہر ہے کہ ان سب حضرات کے نزدیک صابیہ نسلی نام نہیں ہے بلکہ مذہبی ہے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ نام نسلی ہے۔ یعنی شروع میں صابی یا اسی سے ملتی جلتی کسی لفظ کے نام کا کوئی شخص ہوگا، یہ لوگ اس کی طرف منسوب ہوتے ہوں گے۔ خود ارباب لغت اور مورخین بھی اس سے خالی الذہن نہیں تھے، چنانچہ اوپر یہ قول گزر اہی ہے کہ لوگ حضرت نوح کے چچا صابی کی نسبت سے صابیہ کہلاتے تھے[3]۔ اس کے علاوہ جوسن کی کتاب کے حوالہ سے بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ برھیا

---

[1] FOREIGN VOCABULARY OF THE QURAN R191

[2] قدیم اڈیشن ج ۲ ص ۲۰۹ لفظ حنیف

[3] الآثار الباقیۃ البیرونی ص ۲۰۶

سے صابی نام کا ایک شخص ایک کتاب لے کر آیا تھا جسے وہ الہامی کتاب کہتا تھا۔ یہ دونوں بیانات صحیح ہوں یا غلط، ان سے بہر حال یہ بات، تو ثابت ہوگئی کہ صابیہ نسلی نام بھی ہو سکتا ہے۔ آگے چل کر تاریخ کے مختلف ادوار میں چونکہ ان لوگوں نے مذہبی اعتبار سے مختلف چولے بدلے اس لیے اس کی مناسبت سے لفظ وضع ہوتے رہے۔ ایک فرقہ نے بپٹسٹ مذہب (مغتسلہ) اختیار کیا تو صابی کے معنی بپٹسٹ ہو گئے اور ایک فرقہ نے مذہب حنیفی قبول کر لیا تو صبا تخف کے معنی میں مستعمل ہونے لگا اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ کے پیدائشی گاؤں ناصرہ کی طرف منسوب کر کے پیروانِ حضرت عیسیٰ کو نصاری کہتے ہیں۔ مگر پھر اسی سے فعل تنصّر بنا لیا گیا جس کے معنی مذہب عیسائیت کو قبول کرنا ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ان لوگوں کا بالکل شروع میں مذہب کیا تھا ہم اور عہد لعہد اس میں کیا تغیر و تبدل پیدا ہوا؟ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ در اصل یہ لوگ حضرت ادریس کے متبع تھے۔ اس سلسلہ میں امور ذیل پیش نظر رکھنے چاہیے۔

(۱) حضرت ادریس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ یہ حضرت آدم کے بعد پہلے پیغمبر ہیں۔ ان کا نام اخنوخ تھا اور یہ وہی ہیں جن کو بائبل میں (ENOCH) کہا گیا اور جنھیں حضرت نوح کا جد امجد بتایا گیا ہے۔

(۲) حضرت ادریس کے جو اوصاف و کمالات بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک اہم وصف اور کمال یہ تھا کہ وہ علم النجوم کے بڑے ماہر اور فاضل تھے۔

(۳) حضرت ادریس کو ہرمس بھی کہتے تھے[۲]۔

(۴) صابیہ کے ساتھ نجوم و کواکب کے احترام و پرستش کی روایات اس طرح وابستہ ہیں کہ ان کا نام سنتے ہی ذہن اجرام علویہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

(۵) مسعودی کا بیان پہلے گزر چکا ہے کہ صابیہ ملوک روم میں سے ہرمس کو پیغمبر مانتے تھے۔

---

[۱] مفردات امام راغب اصفہانی ص ۲۷۴ ۵۱

[۲] مروج الذہب ج ا ص ۳۹ و الآثار الباقیہ ص ۲۰۱

(۶) ایک قول یہ گزر چکا ہے کہ حضرت نوح کے چچا کا نام صابی تھا اور صابیہ ان کی نسبت سے صابیہ کہلاتے تھے۔

ان سب تنقیحات کو بیک وقت پیش نظر رکھ کر غور کیجئے تو یہ قیاس کرنا مستبعد نہیں رہتا کہ صابیہ دراصل حضرت ادریس کی متبع اور ان کی امت تھے۔ اس بنا پر یہ لوگ موحد تھے۔ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے اور خدا کی عبادت کرتے تھے۔ لیکن جیسا کہ ہر مذہب کا قاعدہ ہے ایک عرصہ گزرنے کے بعد یہ اپنے مذہب کی تعلیمات سے دور جا پڑے۔ حضرت ادریس کے واسطہ سے ان لوگوں میں علم النجوم کا بڑا چرچا تو تھا ہی۔ آخر یہ لوگ کواکب پرستی کرنے لگے اور ان کے ہیاکل و تماثیل کی پوجا کی شکل میں بت پرستی میں مبتلا ہو گئے چنانچہ مسعودی کا بیان ہے:

"جب ان لوگوں پر ایک زمانہ گذرا تو یہ بتوں کی پوجا اس خیال سے کرنے لگے کہ یہ ان کو اللہ سے قریب کریں گے اور یہ لوگ عبادت کواکب سے مانوس ہو گئے[1]"

مندرجہ بالا عبارت کے بعد مسعودی نے لکھا ہے کہ ان لوگوں کی کواکب پرستی اس وقت تک جاری رہی جبکہ ان میں بوداسف کا ظہور ہوا۔ لیکن ہماری رائے میں یہ غلط ہے کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں بوداسف کے ہاں سرے سے خدا کے وجود کا کھلے اور صاف لفظوں میں اعتراف موجود نہیں ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی بعثت انھیں لوگوں میں ہوئی اور یہ دعوت ابراہیمی کا اثر تھا کہ یہ لوگ پھر موحد ہو گئے۔

حضرت ابراہیم کی بعثت انھیں لوگوں میں ہوئی۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کلدان میں پیدا ہوئے تھے جس کو عام طور پر مورخین صابیہ کا وطن بتلاتے ہیں[2]۔ اس کے علاوہ

---

[1] مروج الذہب ج ۲ ص ۲۴۷

[2] ڈاکٹر اسپرنگر کہتے ہیں "حرانی اپنے مذہب میں جو قدیم کلدانیوں کا مذہب تھا" عباسی خلافت کے قیام کے بعد بھی پختہ رہے" انگریزی ترجمہ مروج الذہب جلد اول ص ۲۰۶ پھر بھی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے "صابیہ اور کلدانی یا کنعانی ایک ہی تھے" (ص ۲۱۸)

قرآن مجید سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے. صابیہ نے کواکب وعقول کے ہیاکل وتماثیل بنا رکھے تھے جنھیں وہ پوجتے تھے حضرت ابراہیم نے ان کو توحید کی دعوت دی تو فرمایا۔

ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون ط — یہ مجسمے جن سے تم لگے بیٹھے ہو کیا ہیں؟ یعنی ان کی کیا حقیقت ہے؟

اور اس کے بعد فرمایا۔

بل ربکم رب السموات والارض الذی فطرھن وانا علی ذلکم من الشھدین (الانبیاء) — بلکہ تمہارا رب تو آسمان اور زمین کا وہ رب ہے جس نے ان (ستاروں وغیرہا) کو پیدا کیا ہے اور میں اس بات کے لیے گواہ ہوں.

یہ لوگ ستاروں کو عالم کائنات میں موثر بالذات مانتے اور ان کی پرستش کرتے تھے. حضرت ابراہیم نے اس کا توڑ اس طرح کیا کہ ایک مرتبہ یہ لوگ ایک میلہ میں جانے لگے تو انھوں نے حضرت ابراہیم سے کہا: آپ بھی چلئے. حضرت ابراہیم نے ستاروں پر ایک نظر کی تاکہ یہ لوگ سمجھیں کہ یہ جو کچھ ہورہا ہے (ان کے عقیدہ کے مطابق) ستاروں کی گردش کے اثر سے ہورہا ہے، اور پھر فرمایا "میں تو بیمار ہوں" قرآن نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے.

فنظر نظرۃً فی النجوم ہ فقال انی سقیمٌ ہ (الصفت) — تب ابراہیم نے ستاروں پر ایک نظر ڈالی اور کہا بے شبہ میں بیمار ہوں.

اسی طرح سورۂ الانعام میں حضرت ابراہیم کا مشہور واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے آسمان پر ستارہ دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے، وہ غروب ہوگیا تو کہا: میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا، پھر چاند اور سورج کے ساتھ بھی علی الترتیب یہی معاملہ پیش آیا تو آخر میں بول اٹھے:

یٰقوم انی بریٔ مما تشرکون ہ انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین ہ — اے میری قوم! تم جن چیزوں کو خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بری ہوں، میں نے تو اپنا رخ اس ذات کی طرف کرلیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں.

اس سے بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی بعثت ان لوگوں میں ہوئی تھی جو کواکب اور اجرام علویہ کی پرستش کرتے تھے۔

اب رہی یہ بات کہ صابیہ نے حضرت ابراہیم کی دعوت کو قبول کر لیا تھا اور وہ پھر موحد بن گئے تھے، اس کا ثبوت خود تاریخ سے ملتا ہے۔ ابن ندیم صابیہ، کے بارہ میں جس کی معلومات ڈاکٹر اسپرنگر کے بقول سب سے زیادہ صحیح اور مستند ہیں کیونکہ وہ بابل میں رہا ہے، لکھتا ہے[2]

قال احمد بن عبد اللہ بن سلام مولی امیر المومنین هارون احسبه الرشید: ترجمت هذا الکتاب من کتاب الحنفاء وهم صابئون الابراهیمیة الذین امنوا بابراهیم علیه السلام وحملوا عنه الصحف التی انزلها الله علیه

احمد بن عبد اللہ بن سلام جو امیر المومنین ہارون (غالباً رشید) کے آزاد کردہ غلام تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس کتاب کا ترجمہ کتاب الحنفا سے کیا تھا اور یہ حنفا وہ ابرہیمی صابیہ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور اللہ نے جو صحیفے ان پر نازل کیے تھے انھوں نے ان کو اپنی آسمانی کتابیں مان لیا تھا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ صابیہ کواکب پرستی اور شرک سے تائب ہو کر اللہ اور اس کے رسولوں پر اور عذاب و ثواب پر ایمان لے آئے تھے، نماز پڑھنے لگے تھے اور کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کا فرق کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ابن ندیم احمد بن الطیب کی ایک تحریر کے حوالہ سے بیان کرتا ہے جس کو اس نے کندی سے نقل کیا ہے:

'یہ قوم (صابیہ) اس پر متفق ہے کہ عالم کے لیے ایک علت ہے جو ازلی اور ابدی ہے۔ واحد ہے، اس میں کثرت نہیں ہے۔ معلولات کی کوئی صفت اس کو لاحق نہیں ہوتی۔ اس نے اپنی مخلوقات میں سے اہل تمیز و عقل کو اس بات کا مکلف کیا ہے

---

[1] انگریزی ترجمہ مروج الذہب جلد اول ص ۲۱۸

[2] الفہرست ص ۳۲ یہ صحف ابراہیم جن کا ذکر قرآن میں بھی ہے تعداد میں کتنے تھے؟ ابن ندیم نے ان کی تعداد دس لکھی ہے ص ۳۳۔

کہ اس کی ربوبیت کا اقرار کریں اور ان کے لیے راستے واضح اور روشن کیے ہیں اور اس نے لوگوں پر اپنی حجت تمام کرنے اور ان کو راہ حق دکھانے کی غرض سے رسولوں کو بھیجا ہے اور ان کو اس کا حکم کیا ہے کہ وہ اس کی رضا کی طرف لوگوں کو دعوت دیں اور اس کے غضب سے ان کو ڈرائیں[1]"

پھر آگے چل کر انھیں کی نسبت مرقوم ہے:

"یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے اور حنیفیت کی طرف بلاتے تھے۔ ان لوگوں کے ہاں نماز بھی تین وقت کی تھی قبلہ بھی تھا روزے بھی تیس دن کے تھے۔ جنابت سے غسل کرنے کا حکم بھی۔ اور محرمات طعام بھی تھے[2]"

سید محمود شکری الآلوسی تو حران میں بھی ان لوگوں کا پتہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں[3]:

وھولاء کانوا قوم ابراھیم الخلیل	اور یہ لوگ حضرت ابراہیم خلیل کی قوم
وھم اھل دعوتہ کانوا بحران فھی	اور ان کے اہل دعوت تھے اور یہ
دار الصابیۃ	حران میں تھے اور حران صابیہ کا وطن ہے

پھر ان لوگوں کے اعمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان صابیہ میں متعدد گروہ ایسے ہیں جو ماہ رمضان کے روزے رکھتے ہیں، نماز کعبہ کی طرف رخ کرکے ادا کرتے ہیں، مکہ کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، مردار خون اور خنزیر کو حرام جانتے ہیں، ذوی الارحام سے نکاح کو مسلمانوں کی طرح حرام سمجھتے ہیں[4]۔

یہی وہ صابیہ ہیں جن کی نسبت متعدد مورخین نے لکھا ہے کہ دمشق کی مسجد جامع انھوں نے بنائی تھی[5]۔

---

[1] الفہرست صفحہ ۴۴۲

[2] ایضاً صفحہ ۴۴۳

[3] بلوغ الارب ج ۲ ص ۲۲۳

[4] ایضاً

[5] عجب نامہ مقالہ جھوسی بڈرسن ص ۲۸۸

بہر حال مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ صابیہ اور حنفا دونوں مترادف الفاظ ہیں اور قرآن جن کو صابیہ کہتا ہے وہ حجاز میں کم از کم حنفا کے نام سے معروف تھے۔

لیکن معاملہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حنفا کون تھے؟ اصل یہ ہے کہ جو صورت حال صابیہ کے معاملہ میں پیش آئی ہے وہی حنفا کے سلسلہ میں پیش آئی یعنی درحقیقت حنفا وہی لوگ تھے جو حضرت ابراہیم کے دین کے متبع اور اس کے پیرو تھے اور توحید پر ایمان رکھتے تھے۔ لیکن جب عرب میں عمر بن لحی الخزاعی نے بت پرستی اور شرک کی ترویج کی تو بہت سے لوگ جو حنفا کہلاتے تھے، وہ بھی صراط مستقیم سے ہٹ کر بت پرستی میں مبتلا ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ حنیفیت نام شرک کا ہو گیا۔ چنانچہ عہد جاہلیت میں بت پرست بھی عام طور پہ کہتے تھے کہ ہم دین ابراہیم پر ہیں۔[1]

ایک روایت ہے کہ ابو عامر بن النعمان بن صیفی نے جوگ لے لیا تھا اور جسم پر ٹاٹ لپیٹے رہتا تھا۔ ایک مرتبہ یہ مدینہ آیا تو حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا آپ کیا لائے ہیں"؟ آپ نے فرمایا: "حنیفیت یعنی دین ابراہیم" اس شخص نے کہا: میں بھی تو اسی پر قائم ہوں "حضور نے فرمایا! تو حنیفیت پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ تو نے اس میں ان چیزوں کو داخل کر لیا ہے جن کا حنیفت سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔[2]" اس روایت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ امتداد روزگار سے حنیفت کی بھی اصل شکل و صورت مسخ ہو گئی تھی اور اصل و مسخ شدہ صورتوں میں ایسا التباس پیدا ہو گیا کہ لوگ عام طور پر دونوں میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار (لفظ حنیف) کی طرح پڈرسن لکھتا ہے:

" حنیف کے معنی بس وہی ہو سکتے ہیں جو شامی لفظ "حنفہ" کے ہیں یعنی مشرک[3]۔ پھر جو لوگ صراط مستقیم سے بہک گئے تھے ان کا معاملہ صرف بت پرستی تک محدود نہیں رہا بلکہ یہ لوگ ایک طرف

---

[1] تاریخ العرب قبل الاسلام جلد ۶ ص ۲۵۰

[2] تفسیر روح المعانی جلد ۹ ص ۱۱۱

[3] عجیب نامہ ص ۳۹۰

یہودیت اور عیسائیت سے متاثر ہوئے اور دوسری جانب نو افلاطونیت نے ان پہ اپنا رنگ جمایا تو پھر وہی عقول عشرہ نفوس مجردہ اور نجوم و کواکب کی باتیں کرنے لگے۔ اس طرح حنیفیت اپنی مسخ شدہ صورت میں بھی کسی ایک خاص نہج پر قائم نہیں رہی اور مختلف عقائد و افکار کا معجون مرکب بن گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ حنیفیت کے معنی و مفہوم بھی بدلتے رہے۔ جس نے حنیفیت کو جس رنگ میں دیکھا اس کے وہی معنی بیان کر دیے[1]

دنیا میں خیر اور شر ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر غلبہ کبھی اس کا ہوتا ہے اور کبھی اُس کا۔ جس طرح ہدایت کے بعد گمراہی پیدا ہوتی ہے، اسی طرح گمراہی جب عام اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے تو کچھ سعادت مند روحوں کو حق و ہدایت کی جستجو ہوتی ہے۔ ان میں جو خوش نصیب ہوتے ہیں وہ گوہر مقصود پا لیتے ہیں اور دوسرے جستجو ہی کرتے کرتے حسرت لیے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں چنانچہ جب حنیفیت کی اصل شکل مفقود ہو گئی تو بعثت محمدی کے قریبی عہد میں عرب میں ایک طبقہ پیدا ہوا جو بت پرستی اور مشرکانہ اعمال سے سخت بیزار اور متنفر ہو کر اصل حنیفیت یعنی دین ابراہیمی کی تلاش میں نکل پڑا۔ یہ طبقہ حنفا تھا۔ جو شخص بت پرستی سے جو قریش کا عام مذہب تھی، بیزار ہو کر توحید کا قائل ہوتا اور دین ابراہیمی کے گمشدہ راستہ پر چلنے کی کوشش کرنے لگتا تھا، قریش اسی کے متعلق "صبأ فلان" کے الفاظ کہتے تھے اور چونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دین ابراہیمی کے داعی اور مجدد تھے، اس بنا پر قریش حضور کی نسبت بھی یہ جملہ بولتے تھے جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں۔

اس طبقہ میں ایک ممتاز شخصیت زید بن عمرو بن نفیل کی ہے جو حضرت عمر فاروق کے چچا زاد بھائی تھے۔ سیرۃ اسمائے رجال کی کتابوں میں ان کے حالات درج ہیں۔ ان سے اندازہ ہوگا کہ یہ طبقہ احنفا اپنے عقائد و افکار کے اعتبار سے عام عربوں سے کس درجہ ممتاز

---

[1] اسی لیے مسعودی نے حنیفیت کی دو قسمیں کی ہیں ایک حنیفیت اولی جو دعوت ابراہیمی قبول کرنے کے بعد صابیہ کا مذہب تھا اور دوسری حنیفیت ثانیہ جو بت پرستی اور شرک کے ہم معنی تھی (التنبیہ والاشراف ص ۱۱۸)

تھا۔ یہ نہ مشرک تھا، نہ یہودی، نہ نصرانی اور نہ مجوسی، توحید کا قائل تھا اور شرک سے بیزار اور اصل دین ابراہیمی کا جویا۔ چنانچہ زید بن عمرو بن نفیل جن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات تو ہوئی تھی مگر آپ کی بعثت سے پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا۔ کسی شخص نے ان کے متعلق حضور سے سوال کیا تو فرمایا "زید جاہلیت میں عبادت کرتا تھا۔ اسے ابراہیم الخلیل علیہ السلام کے دین کی طلب تھی۔ وہ توحید کا قائل تھا اور کہا کرتا تھا: میرا معبود ابراہیم کا معبود اور میرا دین ابراہیم کا دین ہے۔ وہ قریش کے ذبیحہ پر اعتراض کرتا اور کہتا تھا: اللہ نے بکری کو پیدا کیا، آسمان سے اس کے لیے پانی برسایا اور زمین سے چارہ اگایا اور پھر بھی تم ہو کہ غیر اللہ کا نام لے کر اسے ذبح کرتے ہو۔ جو جانور غیر اللہ کے نام پر ذبح ہوتے تھے زید اسے نہیں کھاتے تھے۔ اس کے علاوہ بچوں کو زندہ درگور دفن کرنے کے سخت مخالف تھے۔ زید کو دین ابراہیمی کی طلب ہوئی تو اس جستجو میں وہ عراق و شام تک پہونچے۔ مگر کہیں اس کا سراغ نہ ملا۔ آخر حیرہ کے ایک شیخ نے بتایا کہ تم خود اہل بیت اللہ میں سے ہو۔ تم جس کی (دین حنیف) تلاش میں ہو اسے لے کر ایک نبی تمہارے ہی درمیان مبعوث ہونے والا ہے، وہ پیدا ہو چکا ہے اور اس کی نبوت کے آثار بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔[1]

زید کو اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا زمانہ دیکھنا نصیب نہ ہوا لیکن چونکہ وہ موحد تھے اور دین ابراہیمی کی طلب صادق رکھتے تھے اس لیے حضور نے ارشاد فرمایا: "زید قیامت کے دن اس طرح اٹھایا جائے گا کہ وہ خود ایک امت ہو گا"[2]

بہرحال جس عہد کا ہم ذکر کر چکے ہیں اس میں جب حنیفیت کی اصل شکل و صورت مسخ ہو کر عقائد و افکار باطلہ کا معجون مرکب بن گئی تو چونکہ دین حنیف اصلاً حضرت ابراہیم کی ہی طرف منسوب تھا اس لیے حنیفیت کی مسخ شدہ صورت کے جس پہلو کا جو گروہ حامل تھا اس نے حضرت ابراہیم کی طرف بھی اس کا انتساب شروع کر دیا۔ چنانچہ جو لوگ مشرک تھے وہ شرک کو، جو یہودی اور نصرانی تھے انھوں نے یہودیت اور نصرانیت کو اور جو نو افلاطونیت (NEO PLATONISM) سے

---

[1] اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابۃ ابن الاثیر ج ۲ ص ۲۳۶-۳۷

[2] اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۳۷

متاثر تھے وہ نوافلاطونی عقائد و افکار کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بڑی شدت، تکرار و تاکید کے ساتھ ان تمام خیالات و افکار باطلہ کی تردید کر کے ان سب چیزوں سے حضرت ابراہیم کی برات کی گئی ہے۔ متعدد آیات اسی مضمون کی اوپر گذر چکی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی آیات ہیں۔ ان کا سیاق و سباق ان کا نظم و نسق کلام یہ سب اس بات کی کھلی دلیل ہیں کہ ان کا مقصد درحقیقت ان خیالات کی پرزور تردید کرنا ہے جو امتداد روزگار اور مختلف داخلی و خارجی اسباب کے ماتحت دین حنیف اور خود حضرت ابراہیم کے متعلق لوگوں میں پیدا ہو گئے تھے اور جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ ان آیات کے علاوہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جب ضرورت ہوئی ان خیالات کی تردید فرمائی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن میں صابیہ سے مراد یہی حنفا ہیں تو پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ ان لوگوں کو زیر بحث آیات میں صابیہ کے نام سے پکارا گیا ہے اور ان کو حنفا نہیں کہا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ عہد نبوت سے ذرا قبل یہ حنفا اچھی خاصی تعداد میں تھے لیکن ان کی حیثیت جو کچھ بھی تھی انفرادی اور شخصی تھی اور انھوں نے کسی مذہبی فرقہ کی شکل اختیار نہیں کی تھی اگرچہ مستشرقین میں ڈاکٹر اسپرنگر کی رائے یہی ہے کہ حنفا ایک شریعت ثابتہ پر قائم تھے اور اسی لیے ایک مستقل فرقہ کی حیثیت رکھتے تھے لیکن عہد حاضر کے نامور محقق ڈاکٹر جواد علی نے اس خیال کی پرزور تردید کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "یہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حنفا ایک رائے اور ایک دین پر تھے اور اس بنا پر وہ ایک ایسا ہی فرقہ تھے جیسا کہ یہودی اور نصاریٰ ہیں، بلکہ دراصل یہ حنفا متفرق قبیلوں کے چند افراد تھے جو کسی خاص ایک رشتہ سے وابستہ نہیں تھے۔ البتہ ان سب میں یہ ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ کہ یہ بت پرستی سے نفور اور اس کے منکر تھے اور اصلاح کے داعی تھے۔ قرآن مجید کی جن آیات میں حنفا کا ذکر ہے ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے[1]"

پس جب حنفا مستقل فرقہ کی کوئی شکل نہیں رکھتے تھے تو جہاں قرآن مجید یہود، نصاریٰ اور مجوسی ایسے مستقل مذہبی فرقوں کا ذکر کر رہا تھا، وہاں بلاغت کلام کا تقاضا یہی تھا کہ ان کو اس

---

[1] تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۵ ص ۵۹

نام سے پکارا جائے جوان کا دیرینہ فرقہ وارانہ نام (یعنی صابیہ) تھا، اور یہ بلاشبہ جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہوتا ہے حضرت ابراہیم کے اصل دین حنیف کے قائل ہونے کے باعث موحد اور اہل کتاب تھے۔

آخر میں اتنا اور عرض کر دینا ضروری ہے کہ جب دعوت محمدی کا غلغلہ بلند ہوا تو جس طرح یہود اور نصاریٰ میں جو خوش نصیب اور سعادت مند تھے، انھوں نے اس پیغام کو لبیک کہا اور دل و جان سے قبول کیا مگر جن کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی وہ اپنی ضد پر جمے رہے اور گمراہی سے نجات نہیں پا سکے۔ اسی طرح حنفا کے اس گروہ میں بھی دین و دنیا کی فلاح جن کے مقدر میں تھی انھوں نے اسلام کی دعوت کو قبول کیا اور جس گوہر مقصود کی جستجو میں یہ سرگرداں تھے اسے پالیا۔ لیکن امیۃ بن ابی الصلت جس کی نسبت اس کے اشعار دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

امن لسانہ وکفر قلبہ[1]

اس کی زبان ایمان لائی ہے اور اس کے قلب نے کفر کیا ہے۔

یہ اور اس جیسے اور بعض حنفا جن کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی وہ اس سے محروم ہی رہے اس بنا پر قرآن کی صابیہ والی آیات میں ان لوگوں کو یہود و نصاریٰ کے دوش بدوش ذکر کر کے فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں میں سے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لے آئیں گے (یعنی دعوت محمدی قبول کریں گے) اور اعمال صالحہ کریں گے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہوگا۔ ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الشعر

الاُمِّیّون

قرآن مجید میں الامیون کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "امی" کی صفت سے موصوف کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:-

"فآمنوا باللہ ورسولہ النبی الامی الذی یومن باللہ وکلماتہ واتبعوہ لعلکم تہتدون" (الاعراف)

تو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر جو امی نبی ہیں اور جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان لاتے ہیں اور اس پیغمبر کی پیروی کرو تاکہ تم سیدھے راستے پر چلو۔

ہمارے ہاں عام طور پر مشہور ہے کہ امی اسے کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ اور چونکہ یہ لوگ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی نوشت و خواند سے نابلد تھے اس لیے قرآن میں ان کو "امیون" کہا گیا ہے اور خود حضور بھی ایسے ہی تھے اس لیے آپ کی صفت امی بیان کی گئی ہے۔ مفسرین نے عام طور پر اسی معنی کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں:-

"الامیین "الذین لا یکتبون ولا یقرؤن[1]

امی وہ لوگ ہیں جو نہ لکھنا جانتے ہوں اور نہ پڑھنا

پھر اس کی لغوی توجیہ میں فرماتے ہیں کہ "لکھنے کا فن مردوں میں پایا جاتا تھا، عورتوں میں نہیں۔ اس بنا پر جو لوگ لکھنا نہیں جانتے تھے ان کو ماں کی طرف منسوب کرکے امی

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری ج ۲ ص ۲۵۷

کہا گیا ہے[1]۔ طبری نے امیین کی یہ تشریح سورۂ البقرۃ کی حسب ذیل آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں کی ہے۔

"ومنھم امیون لا یعلمون الکتٰب الا امانی وان ھم الا یظنون" (آیت ۷۸)

اور ان میں کچھ امی ہیں جو کتاب کو نہیں جانتے سوائے من مانی باتوں کے، اور یہ صرف ظن اور تخمین سے کام لیتے ہیں

مگر سورۂ آل عمران میں بھی ایک آیت ہے جس میں یہ لفظ آیا ہے اور وہ یہ ہے۔

"وقل للذین اوتوا الکتٰب والامیین أأسلمتم ط فان اسلموا فقد اھتدوا وان تولوا فانما علیک البلاغ ط واللہ بصیر بالعباد" (آیت ۲۰)

اور وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی ہے اور جو امی ہیں، اے محمد، آپ ان سے کہہ دیجیے کہ کیا تم اسلام لے آئے ہو؟ پس اگر وہ اسلام لے آئے ہیں تو وہ ہدایت یافتہ ہوگئے اور اگر انھوں نے سرتابی کی تو بس آپ پر تو پہونچا نا ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے۔

طبری نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

"الامیین الذین لا کتاب لھم من مشرکی العرب[2]"

امیین سے مراد مشرکین عرب ہیں جن کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔

یہی لفظ سورۂ الجمعۃ کی ایک آیت میں بھی آیا ہے:

"ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم اٰیٰتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین" (آیت ۲)

وہ خدا وہ ہے جس نے امیین میں انھیں میں سے ایک رسول کو ظاہر کیا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ یہ لوگ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

اس آیت کی تفسیر میں تقریباً سب مفسرین لکھتے ہیں کہ اس میں امیین سے مراد عرب ہیں۔ چنانچہ عہد حاضر کے مقبول مفسرین، سید رشید رضا صاحب "تفسیر المنار" اور شیخ محمد

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری ج ۲ ص ۲۵۹
[2] ایضاً ج ۶ ص ۲۸۱

جمال الدین القاسمی صاحب "تفسیر القاسمی" نے یہی لکھا ہے۔

اب مذکورہ بالا تینوں آیات جن میں امیون کا لفظ آیا ہے ان کو بیک وقت سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین نے امیون کے کوئی ایک معین معنی مراد نہیں لیے ہیں بلکہ یہ لفظ تین جگہ آیا ہے تو ہر جگہ معنی بھی ایک دوسرے سے مختلف مراد ہیں اور اس بنا پر حسب ذیل تنقیحات پیدا ہوتی ہیں:

(۱) اگر امیون سے مراد وہ لوگ ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے تو یہ لفظ مشرکین اور اہل عرب کے ناخواندہ لوگوں پر بھی صادق آسکتا ہے۔ پھر سورۂ آل عمران کی آیت کی تفسیر میں امیین سے فقط مشرکین کو مراد لینا کیونکر صحیح ہوگا؟

(۲) اگر اس سے مراد مشرکین ہیں تو اب اس پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں، ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی امی کہا گیا ہے، پھر اس کے معنی کیا ہوں گے اور دوسرا اعتراض یہ ہے کہ سورۂ البقرہ کی آیت میں اہل کتاب میں سے بھی بعض لوگوں کو امیون فرمایا گیا ہے، اس کی توجیہ کیا ہوگی؟

(۳) سورۂ الجمعۃ کی آیت کی تفسیر میں اگر امیون سے مراد عرب ہیں تو پھر سورۂ البقرۃ اور سورۂ آل عمران کی آیتوں میں علی الترتیب امیون سے ناخواندہ اور مشرک مراد لینا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ لوگ جس طرح عرب میں پائے جاتے ہیں غیر عرب میں بھی پائے جاتے ہیں۔

ان سب سوالات کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مکّہ کے لوگوں کی صفتِ غالبہ نوشت و خواند سے عاری ہونا تھی اس لیے الامیون ان کا اسم صفتی ہو گیا اور چونکہ یہ لوگ عرب بھی تھے اور مشرک بھی، اس لیے اس لفظ کا اطلاق ان دونوں پر بھی مجازاً ہونے لگا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا نوشت و خواند سے عاری ہونا واقعی وادی قری کے اصحاب کی ایسی خصوصیت تھی جس میں وہ دوسرے لوگوں سے اس درجہ ممتاز تھے کہ وہ ان کی صفت غالبہ بن سکتی تھی؟ تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔

سیر و تاریخ کی کتابوں میں ایسے حضرات کے نام جا بجا ملتے ہیں جو عہد جاہلیت میں

نوشت و خواند سے اچھی طرح آشنا تھے۔ سہیلی نے ایسے صحابہ کے ناموں کی فہرست دی ہے جو بارگاہ نبوی میں تحریر و کتابت کی خدمت انجام دیتے تھے[1]۔ ان میں بعض حضرات جو اس فن میں خاص درک و کمال رکھتے تھے "الکاتب" ان کے نام کا جز ہی ہو گیا تھا۔ حضرت حنظلۃ بن الربیع کا شمار ان ہی لوگوں میں تھا۔ چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو ایک شاعرہ نے مرثیہ میں کہا:

ان سواد العین اودی بہ　　حزن علی حنظلۃ الکاتب

دربار نبوی میں جو صحابہ تحریر و انشا کی خدمت انجام دیتے تھے ان کی تعداد کتنی تھی؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عمر بن شبیہ نے خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی[2]۔ ابو عبد اللہ محمد بن عبدوس الجہشیاری (م ۳۳۱ھ) نے بھی ان صحابہ کے نام لکھے ہیں اور اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف شعبے قائم کر رکھے تھے اور ہر شعبہ کا تحریری کام خاص خاص صحابہ کے سپرد تھا۔ ان شعبوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) کتابت وحی: اس پر حضرت علی اور حضرت عثمان مقرر تھے۔ ان کی غیر حاضری میں ابی بن کعب اور زید بن ثابت یہ کام کرتے تھے۔

(۲) پیشکاری: خالد بن سعید اور معاویہ بن ابی سفیان۔

(۳) معاملات عامہ: مغیرہ بن شعبہ اور حسن بن نمر۔

(۴) عبد اللہ بن ارقم اور علاء بن عقبہ اس پر مامور تھے کہ قبائل اور انصار کے جو اندرونی معاملات تھے ان کے متعلق تحریری کام کرتے تھے۔

(۵) زید بن ثابت: کتابت وحی کے ساتھ بادشاہوں سے خط و کتابت کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔

(۶) دفتر مغانم: معیقیب بن ابی فاطمہ۔

(۷) حنظلہ بن الربیع کے لیے کوئی شعبہ مخصوص نہیں تھا۔ بلکہ جب کسی شعبہ کا کوئی کاتب غیر حاضر

---

[1] الروض الانف، ج ۲ ص ۲۳۰

[2] کتاب التنبیہ والاشراف مسعودی ص ۲۸۳

ہوتا تھا تو یہ اس کی قائم مقامی کرتے تھے اور حضور کی مہر بھی انھیں کے پاس رہتی تھی[1]۔

ان شعبوں کا ذکر مسعودی نے بھی کیا ہے اور ان پر حسب ذیل شعبوں کا اضافہ کیا ہے:

(۱) اموال صدقات: زبیر بن عوام اور جہیم بن الصلت۔

(۲) نخلستان کا حساب و کتاب: حذیفۃ بن الیمان۔

مسعودی دربار نبوی کے کاتبین کا شعبہ وار تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:

ہم نے یہاں صرف ان حضرات کا تذکرہ کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مستقلاً ایک مدت تک کتابت کی خدمت انجام دیتے رہے تھے اور اس بات کا قطعی ثبوت بھی موجود ہے۔ ان کے علاوہ جن لوگوں نے عارضی طور پر یہ کام کیا تھا ہم نے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے[2]۔

پھر ان حضرات میں ایسے بھی لوگ تھے جو عربی زبان کے علاوہ فارسی، رومی قبطی اور حبشی زبانوں میں بھی کتابت کر سکتے تھے۔ زید بن ثابت نے یہ سب زبانیں مدینہ میں خود اہل زبان سے سیکھی تھیں اور بارگاہ نبوی میں ترجمان کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے[3]۔ حضرت عمرو بن العاص بھی عبرانی اور سریانی زبانوں میں کتابت کرتے تھے[4]۔ عورتیں تک اس فن سے واقف تھیں۔ اس سلسلہ میں شفا بنت عبداللہ مشہور تھی[5]۔ ان سب سے قطع نظر خود قرآن مجید سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بعثت نبوی کے وقت عرب میں کتابت مروج تھی۔ ارشاد ہے:

"یاایھا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ" (البقرۃ)	اے ایمان والو! جب تم آپس میں کسی مقررہ مدت کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لو۔

---

[1] کتاب الوزراء و الکتاب ص ۹

[2] کتاب التنبیہ والاشراف ص ۲۸۴

[3] مسعودی ص ۲۸۳ جلد ۴ س ۲

[4] طبقات ابن سعد جلد ۴ ص ۲

[5] الروض الانف ج ۲ ص ۲۳۰

ایک اور آیت ہے۔

"فویل للذین یکتبون الکتٰب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللّٰہ" (البقرۃ)

پس ان لوگوں کے لیے ہلاکت ہے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں "یہ اللہ کی طرف سے ہے۔"

قرآن میں کتاب کا لفظ مفرد اور جمع دو سو اکسٹھ مرتبہ آیا ہے[1] اور کتابت سے متعلق جو چیزیں ہیں مثلاً کاغذ، روشنائی، قلم، دوات، پھر خود کتاب کے لیے عربی زبان میں جو مختلف الفاظ ہیں مثلاً صحیفہ، زبور وغیرہ ان کا قرآن میں جا بجا تذکرہ ہے۔ یہ بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب فن کتابت سے نا آشنا نہیں تھے۔ بقول ابن فارس کے جہاں تک نوشت و خواند کے جاننے کا تعلق ہے۔ عرب اسلام سے پہلے ایسے ہی تھے جیسے آج کل ہیں۔ یعنی پہلے بھی ہر شخص اس سے واقف نہیں تھا اور آج بھی ہر ایک اس سے آشنا نہیں[2]۔

ہمارے زمانہ کے نامور محقق ڈاکٹر جواد علی لکھتے ہیں:

"ہم اس بات کا خیال بھی نہیں کر سکتے کہ اہل جاہلیت کے سب لوگ امی تھے اور ان میں کوئی قاری اور کاتب نہیں تھا۔ ہمیں معلوم ہے اکثر لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے کیونکہ ان کے نوشتہ آثار جو دستیاب ہوئے ہیں اس کا بین ثبوت ہیں علاوہ بریں مورخین عام طور پر کہتے ہیں کہ قریش میں ارباب نوشت و خواند کا قحط نہیں تھا[3]"

حال میں مصر کے ایک فاضل ڈاکٹر ناصر الدین الاسد نے "مصادر الشعر الجاہلی" کے نام سے ایک بلند پایہ محققانہ کتاب لکھی ہے جس میں (از ص ۴۶ تا ۱۰۳) بڑی تفصیل سے اس پر بحث کی ہے کہ عرب قبل الاسلام میں قرأت و کتابت کا فن کس قدر مروج تھا؟ یہ کن کن زبانوں کی کتابت

---

[1] المعجم المفہرس للقرآن از ص ۵۹۲ تا ص ۵۹۵

[2] الصاحبی ص ۹

[3] تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۶ ص ۹۹

جانتے تھے؟ ان کی کتابت کے موضوعات کیا تھے؟ کتابت کا ساز و سامان کیا تھا؟ اس فن میں نامور اور مشہور کون کون لوگ تھے؟ اور کتابت کی تعلیم کے مدرسے کہاں کہاں قائم تھے؟ موصوف نے جو کچھ لکھا ہے مدلل اور مفصل لکھا ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ عرب قبل الاسلام کو من حیث المجموع بالخاص مکہ اور اس کے اطراف و جوانب کے عربوں کو "امیون" کا لقب ہرگز اس معنی میں نہیں دیا گیا کہ انھیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔[1]

یہ گفتگو تو عام عربوں سے متعلق تھی۔ اب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے تو اگرچہ مشہور یہی ہے کہ آپ نوشت و خواند سے ناآشنا تھے لیکن علما کا ایک طبقہ اس خیال سے متفق نہیں ہے۔ چنانچہ عہد حاضر کے نامور عالم اور محقق شیخ محمود محمد شاکر لکھتے ہیں:

• وقد یماً قام بعض اساتذ تنا یدعی ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یعرف الکتابة ولکنه لا یحسنها۔[2]

اور پہلے سے ہمارے بعض اساتذہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا جانتے تھے اگرچہ اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔

حافظ ابن حجر نے بھی اس رائے کو متعدد علما رمثلاً ابو الولید الباجی، ابوذر الہروی اور ابو الفتح النیسابوری کی طرف منسوب کرکے لکھا ہے کہ افریقہ کے کچھ اور علما کا بھی خیال یہی تھا۔[3]

---

[1] دراصل اس معاملہ میں غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ زمانۂ قبل الاسلام کو جو عہد جاہلیت کہا جاتا ہے تو لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں کہ یہ جہل علم کی ضد ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جہل علم کی نہیں بلکہ حلم کی ضد ہے جس کے معنی بردباری، سمجھ بوجھ اور متانت و سنجیدگی ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

الا لا یجھلن احد علینا فنجھل فوق جھل الجاھلینا

(ترجمہ۔ خبردار! ہم سے کوئی اجڈپن کی باتیں نہ کرے ورنہ پھر ہم اجڈ لوگوں سے بڑھ کر اجڈ ہونگے)

[2] تفسیر ابن جریر طبری (حاشیہ) ج ۲ ص ۲۸۵

[3] فتح الباری ج ۷ ص ۴۰۵

اس کے علاوہ سہیلی نے بھی ایسے حضرات کی نشاندہی کی ہے[1]۔ ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ حدیبیہ کے واقعہ سے متعلق صحیح بخاری میں جو روایت ہے اس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت علی صلحنامہ لکھ رہے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جب لکھا "ہٰذا قاضی علیہ محمد رسول اللہ" تو اس پر قریش کے نمائندوں نے اعتراض کیا اور کہا اگر ہم آپ کو رسول اللہ مانتے ہی ہوتے تو آپ کو روکتے کیوں؟ حضور نے فرمایا: "میں تو خیر رسول اللہ ہوں ہی" اور حضرت علی کو حکم دیا کہ "رسول اللہ" کے الفاظ مٹا دیں۔ حضرت علی نے جب اس حکم کی تعمیل سے معذرت خواہی کی، تو اب وہ نوشتہ حضور نے خود لے لیا اور اس پر تحریر فرمایا "ھذا ما قاضی محمد بن عبد اللہ الی آخرہ"۔ اصل الفاظ جو اس موقع پر ہیں وہ یہ ہیں:

"فاخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکتٰب فکتب۔" — اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نوشتہ خود لے لیا اور تحریر فرمایا۔

بخاری میں یہ روایت ایک ہی اسناد سے دو جگہ مذکور ہے۔ اولاً کتاب الصلح میں اور ثانیاً کتاب المغازی کے ماتحت باب عمرۃ القضا میں۔ دونوں جگہ الفاظ ایک ہی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ثانی الذکر روایت میں "فکتب" کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں "ولیس یحسن لکتاب"۔

ابن سعد نے بھی واقعہ حدیبیہ کے ذکر کے سلسلہ میں اس موقع پر جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں:

"لما کتب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الکتاب الذی بینہ وبین اہل مکۃ"

اس کے بعد عہد نامہ لکھا گیا تو:

"کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اسفل الکتاب ولنا علیکم مثل الذی لکم علینا۔"[2] — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تحریر کے نیچے لکھا اور تم پر ہمارے حقوق وہی ہوں گے جو ہم پر تمہارے ہیں۔

---

[1] الروض الانف ج ۲ ص ۲۳۰

[2] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۰۱

اس کے علاوہ طبری نے جب یہ واقعہ نقل کیا ہے تو اس میں بھی فعل "کتب" کی اسناد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی ہے[1]۔ غرض کہ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور کتابت جانتے تھے۔ مگر جو حضرات اس کے قائل نہیں ہیں وہ اس میں عجیب طرح کی تاویلات کرتے ہیں، اور وہ یہ ہیں:

(۱) روایت میں فعل "کتب" کے معنی ہیں "امر" اور مطلب یہ ہے کہ حضور نے لکھنے کا حکم دیا، کیونکہ کاتب تو حضرت علی ہی تھے۔

(۲) "ولیس یحسن یکتب" کے معنی یہ نہیں کہ آپ کتابت اچھی طرح نہیں جانتے تھے جس سے حضور کے لیے نفس کتابت ثابت ہو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ کتابت بالکل جانتے ہی نہیں تھے اور "ولیس" "یحسن" کے الفاظ محض بربنائے ادب کہے گئے ہیں۔

یہ دونوں تاویلیں شیخ محمود محمد شاکر نے پوری قوت سے بیان کی ہیں[2]۔ لیکن ایک سرسری نظر سے جائزہ لیا جائے تو ان کی بے حقیقتی ظاہر ہو جاتی ہے چنانچہ ان کے جوابات علی الترتیب یہ ہیں:

(۱) صحیح بخاری کی روایت میں یہ الفاظ صاف طور پر موجود ہیں کہ جب حضرت علی نے رسول اللہ کے الفاظ محو کرنے سے معذرت کی تو "اخذ رسول اللہ الکتاب فکتب" تو ظاہر ہے کہ یہاں کتب کی اسناد حضور کی طرف اسناد حقیقی ہی ہوگی نہ کہ مجازی کیونکہ "کتب" اور "اخذ" دونوں کا فاعل حضور ہیں اور جب "اخذ" کی اسناد حقیقی ہے تو "کتب" کی اسناد بھی ایسی ہوگی۔ ورنہ حضرت علی کی معذرت خواہی پر اخذ کے کیا معنی ہیں؟

(۲) "ولیس یحسن یکتب" کے اگر معنی یہ ہیں کہ "ولیس یکتب" آپ لکھ ہی نہیں سکتے تھے تو اس سے لازم آتا ہے راوی کا حضور کی طرف بیک وقت دو نقیضوں یعنی کتابت و عدم کتابت کا منسوب کرنا۔ اور ظاہر ہے اس سے کلام مہمل ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ یہی

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۸۰

[2] حاشیہ تفسیر ابن جریر طبری ج ۲ ص ۲۵۸

روایت بخاری میں کتاب الصلح کے ماتحت ہے اور اس کے علاوہ طبری اور ابن سعد وغیرہ کے ہاں ہے تو اس میں صرف "کتب" کا لفظ ہے اور "ولیس یحسن یکتب" سرے سے ہے ہی نہیں۔

شیخ محمود محمد شاکر یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس موقع پر کاتب تو حضرت علی تھے۔ پھر حضور کتابت کیوں کرتے؟ جواب یہ ہے کہ جی ہاں! کاتب حضرت علی ہی تھے مگر درمیان میں یہ واقعہ پیش آیا تو حضور نے خود قلم لے لیا اور پہلے "رسول اللہ" کے الفاظ تحریر سے محو کئے اور پھر آگے کی عبارت تحریر فرمائی۔ چنانچہ ابن سعد اور طبری کے ہاں حضرت علی کا نام اس موقع پر بحیثیت کاتب سرے سے مذکور ہی نہیں ہے۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ شیخ نے جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل وہی ہے جسے حافظ ابن حجر اس مسئلہ میں مختلف مکاتب فکر کا تذکرہ کرنے کے بعد مسلک جمہور کی تائید میں لکھ چکے ہیں[1]

اصل بات یہ ہے کہ جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے وہ اپنے منطوق اور مفہوم کے اعتبار سے بالکل صاف اور واضح ہے لیکن اس کے باوجود ان توجیہات و تاویلات کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قرآن مجید کی سورۂ الاعراف کی دو آیتوں (۱۵۷-۱۵۸) میں مسلسل حضور کی صفت امی بیان کی گئی ہے اور امی کے معنی عام طور پر مفسرین، محدثین اور علما کے ہاں یہ ہیں کہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ اور اس چیز کو چونکہ آپ کے لیے بطور ایک معجزہ کے پیش کیا جاتا ہے چنانچہ شیخ سعدی کا نعت میں شعر مشہور ہی ہے۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست   کتب خانۂ چند ملت بشست

اس بنا پر اس سے جو روایت ٹکرائے گی اگر ممکن ہے تو اس کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار ہی کر دیا جائے گا اور اگر یہ ممکن نہ ہوگا تو اس میں توجیہات و تاویلات کی جائے گی۔ خواہ وہ کیسی ہی کمزور اور دور از کار کیوں نہ ہوں۔

بعض علما جو نہ بخاری کی مذکورہ بالا روایت کی صحت سے انکار کر سکتے تھے اور نہ اس میں کسی دور از کار تاویل کے روادار ہو سکتے تھے انھوں نے یہ کہا کہ حضور قرآن کی تصریح کے مطابق

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۴۰۶

شروع شروع میں تو بیشک امی تھے اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لیکن بعد میں آپ ان دونوں سے آشنا ہو گئے تھے۔ ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ قرآن کی ایک اور آیت جس میں حضور کی امیت کا ذکر ہے اس میں "من قبلہ" کی تصریح ہے[1]۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور نزول قرآن کے آغاز میں امی تھے یعنی نوشت و خواند نہیں کر سکتے تھے اور بس[2]! اس سلسلے میں ابن ابی شیبہ وغیرہ کی روایت تو یہاں تک ہے کہ

"ماما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی کتب وقرأ"[3] — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات، اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک کہ آپ لکھ پڑھ نہیں لیے تھے۔

مجالد نے حضرت شعبی سے اس روایت کا تذکرہ کیا تو انھوں نے کہا کہ اس روایت میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو آیت کے منافی ہو۔ ابو الولید الباجی کو اس رائے پر اس درجہ اصرار تھا کہ انھوں نے اس پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا تھا[4] اور جب علمائے اندلس نے ان کے اس خیال کی وجہ سے ان پر زندقہ کا الزام لگایا اور ایک شخص نے یہاں تک کہہ دیا۔

برئیت ممن شری دنیا بآخرۃ وقال ان رسول اللہ قد کتبا

(میں اس شخص سے بری ہوں جو آخرت کے بدلے میں دنیا کو خریدتا ہے اور کہتا ہے کہ بیشک رسول اللہ نے کتابت کی تھی) تو انھوں نے حاکم شہر کی موجودگی میں علما سے مناظرہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن وحیہ کے بقول علما کا ایک طبقہ ان کا ہم خیال بن گیا[5]۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابو الولید الباجی اور ان کے ہم خیال علما پر بھی اعتراض یہ وارد

---

[1] آیت یہ ہے "وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک" (العنکبوت ۴۸)

[2] فتح الباری ج ۷، ص ۵۰۴

[3] ایضاً

[4] تاج العروس ج ۸ ص ۱۹۱

[5] فتح الباری ج ۷ ص ۵۰۴

ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو صفات و اوصاف بیان کیے گئے ہیں، وہ صفات لازمہ ہیں جن کا کسی حال میں آپ کی ذات سے انفکاک نہیں ہوتا۔ اس بنا پر امی کو بھی آپ کے لیے صفت لازمہ ہونا چاہیے اور اب اگر واقعی امی کے معنی لکھنا پڑھنا نہ جاننا ہیں تو عمر کی کسی منزل میں بھی آپ سے یہ صفت جدا نہیں ہو سکتی۔ علی الخصوص اس صورت میں جب کہ عام خیال کے مطابق آپ کی یہ صفت قرآن میں آپ کے لیے بطور معجزہ و دلیل نبوت بیان کی گئی ہو۔

بعض حضرات نے اس سلسلہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کہا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر سچ مچ حضور نے اپنے ہاتھ سے کتابت کی تھی مگر اس بنا پر نہیں کہ آپ کتابت کر سکتے تھے، بلکہ صرف اس لیے کہ خدا کو یہ بھی آپ کے ہاتھوں معجزہ دکھانا تھا کہ جو بالکل امی اور کتابت سے ناآشنا تھا وہ اچانک لکھنے لگا[1] لیکن ظاہر ہے یہ قول بالکل لغو اور ناقابل اعتنا ہے، کیوں کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ایک معجزہ دوسرے معجزہ کی نفی اور تردید بھی کر سکتا ہے۔ اس صورت میں نفس معجزہ کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے۔

سطور بالا میں امیت کے اس معنی و مفہوم سے بحث تھی جو مسلمان خواص اور عوام دونوں میں عام طور پر مشہور و متداول ہیں۔ اس کے علاوہ اس نقطہ کی بعض حضرات نے کچھ اور بھی تشریحات و توجیہات کی ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم بتائیں کہ امیون اور امی کا اصل مفہوم کیا ہے اور قرآن و حدیث میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ ان چند توجیہات کو بھی معلوم کر لینا چاہیے۔ یہ توجیہات حسب ذیل ہیں:

(۱) امی ام القری یعنی مکہ کی طرف منسوب ہے اور اس بنا پر حدیث[2] میں جو "انا امۃ امیۃ" ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم امۃ مکیہ ہیں[3]۔

---

[1] الروض الانف ج ۲ ص ۲۲۳

[2] اس حدیث وغیرہ پر مفصل کلام آگے آ رہا ہے

[3] حاشیہ صحیح مسلم مطبوعہ کلکتہ و مطابعہ محمد علی مصر ج ۲ ص ۱۲۴۴

(۲) امی امت عرب کی طرف منسوب ہے اور اس بنا پر مراد یہ ہے کہ ہم عرب ہیں۔[1]
(۳) بعض حضرات کے نزدیک امی ام سے مشتق ہے اور اس بنا پر امی اس شخص کو کہتے ہیں جو دنیوی امور و معاملات سے ایسا بے تعلق اور بے خبر ہو کہ گویا وہ آج ہی پیدا ہوا ہے "کیوم ولدته امه"۔

اب ان تینوں معنی پر غور کیجئے تو ان کی بے حقیقتی بھی صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ پہلی اور دوسری توجیہہ خاص حدیث مذکور میں چل جائے تو چل جائے قرآن میں جہاں جہاں امیون کا لفظ آیا ہے وہاں نہیں چل سکتی۔ رہی تیسری توجیہ تو ظاہر ہے اس معنی کے اعتبار سے صحابۂ کرام کو امیون کہنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں وہ دنیوی معاملات میں بھی بڑے عقلمند، معاملہ فہم اور زیرک و تجربہ کار تھے۔ کسی گروہ میں اگر تین چار آدمی بھولے بھالے اور سیدھے سادے ہوں تو ان کی وجہ سے پورا گروہ اس صفت سے موصوف نہیں ہو جاتا۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے مفسرین اور علمائے امی اور امیون کے جو معنی بیان کیے ہیں ان میں کوئی معنی اور کوئی مفہوم بھی ایسا نہیں ہے جو ہر جگہ مراد لے لیا جائے اور جس پر کوئی اعتراض، کوئی ایراد اور کوئی شبہ وارد نہ ہوتا ہو۔ اب آیئے خود قرآن اور حدیث کی روشنی میں غور کریں کہ درحقیقت ان الفاظ سے مراد کیا ہے؟

اصل یہ ہے کہ مذہبی اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب کے لوگ دو طبقوں میں منقسم تھے۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا تھا جو اہل کتاب کہلاتے تھے۔ یہ کسی نہ کسی پیغمبر کو بھی مانتے تھے۔ یہ طبقہ یہود و نصاریٰ و مجوس پر مشتمل تھا۔ اس کے بالمقابل دوسرا تھا جو نہ پیغمبر سے باخبر تھا اور نہ کسی کتاب سماوی سے۔ اس بنا پر یہ طبقہ پہلے طبقہ کی نسبت زیادہ شدید گمراہی میں مبتلا تھا۔ بت پرستی کرتا تھا، شرک میں مبتلا اور رذائل اخلاق کا خوگر تھا۔ یہی وہ طبقہ ہے جسے قرآن امیون کہتا ہے۔ اس بنا پر امیون کے معنی ہیں وہ لوگ جو پہلے سے کسی

---

[1] حاشیہ صحیح مسلم مطبوعہ مکتبہ و مطبعہ محمد علی مصر ج ۳ ص ۱۲۴

کتاب الٰہی اور پیغمبر سے آشنا نہ ہوں۔ اس بنا پر ظاہر ہے جو شخص اس طبقہ سے تعلق رکھے گا، ان میں پیدا ہوگا اور ان میں رہ کر نشوونما پائے گا وہ امی کہلائے گا۔ اس لفظ کا تعلق نوشت وخواندسے ہرگز نہیں ہے۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ صرف ہمارا قیاس وتخمین نہیں ہے۔ بلکہ ترجمان قرآن حضرت عبداللہ بن عباس نے امیون کی یہی تشریح کی ہے۔ چنانچہ ابن جریر طبری کا بیان ہے۔

"عن ابن عباس "ومنھم امیون" قال: الامیون قوم لم یصدقوا رسولاً ارسله الله ولا کتاباً انزله الله"[1]

قرآن میں جو "ومنھم امیون" ہے اس کے متعلق ابن عباس سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: امیون وہ لوگ ہیں جنھوں نے کبھی کسی رسول کی تصدیق کی جسے اللہ نے بھیجا ہو اور نہ کبھی ایسی کتاب پر ایمان لائے جسے اللہ نے اتارا ہو۔

لیکن چونکہ حضرت ابن عباس کی یہ تفسیر مفسرین کے مذاق عام کے خلاف تھی اس لیے طبری نے اس کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

"وھذا التاویل تاویلٌ علی خلاف ما یعرف من کلام العرب المستفیض بینھم وذالك ان الامی عند العرب ھوالذی لایکتب"

اور (ابن عباس کی) یہ تاویل اس کے خلاف ہے جو کلام عرب میں مشہور ہے اور وہ یہ کہ امی عرب اس کو کہتے ہیں جو لکھنا نہ جانتا ہو۔

لیکن موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی سند اور دلیل کیا ہے کہ عرب امی اسی شخص کو کہتے ہیں جو لکھنا نہ جانتا ہو اور اس کے برخلاف یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کلام عرب کے اتنے بڑے رمز شناس ونکتہ داں تھے کہ صحابہ میں ان جیسے کم ہی ہوں گے حضرت عمر خود اس فن کے ماہر تھے۔ لیکن آپ کو بھی جب ضرورت پیش آتی تھی تو حضرت ابن عباس سے ہی رجوع کرتے تھے۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ خود قرآن سے کیا ثابت ہوتا ہے ؟ سورۂ آل عمران میں ایک آیت ہے جس میں اہل کتاب اور امیون دونوں کو عطف کے ذریعہ ایک

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری ج ۲ ص ۲۵۸

ساتھ دو متقابل گروہ کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"وقل للذین اوتوا الکتاب والامیین أأسلمتم فان اسلموا فقد اھتدوا۔ وان تولوا فانما علیک البلاغ واللہ بصیر بالعباد" (آیت نمبر ۲۰)

جن لوگوں کو دی گئی ہے کتاب اور جو امی ہیں آپ ان دونوں سے کہہ دیجیے کہ کیا تم اسلام لے آئے ہو؟ اگر وہ اسلام لے آئے ہیں تو انھوں نے ہدایت پائی۔ اور اگر انھوں نے روگردانی کی تو بس آپ پر تو صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔

غور کیجیے اس آیت سے کس قدر واضح طریقہ پر معلوم ہوتا ہے کہ امیون اہل کتاب کے بالمقابل ایک خاص طبقہ اور گروہ کا نام ہے اور چونکہ اہل کتاب وہ لوگ ہیں جو کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے (وھم یتلون الکتب)، اس پر اور پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں اس لیے امیون وہ لوگ کہلائیں گے جو ایسے نہیں ہوں گے۔ یہ اس قدر واضح اور صاف بات ہے کہ جو حضرات امیت کے معنی نوشت وخواند سے عاری ہونا قرار دیتے ہیں انھوں نے بھی اس جگہ امیون سے مراد مشرکین وثنیین لیے ہیں[1]۔ دو چار پڑھے لکھے آدمی ہر گھر اور ہر خاندان میں ہوتے ہیں، اس لیے ان سے کوئی ایک خاص طبقہ الگ نہیں بنتا اور اگر بنتا بھی ہوتا تو دینی و مذہبی سماج کی دنیا میں ہرگز اس کی اتنی اہمیت نہیں ہو سکتی تھی کہ قرآن میں اس کو اہل کتاب کے متقابل و متوازی کی حیثیت سے ذکر کیا جاتا۔

اب سورۃ البقرۃ کی آیت:

"ومنھم امیون لا یعلمون الکتب الا امانی وان ھم الا یظنون ۰ فویل للذین یکتبون الکتب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا، فویل لھم

اور ان (یہود) میں بعض لوگ ہیں جو امی ہیں یہ سوائے من مانی باتوں کے کتاب کو نہیں جانتے اور گمان سے کام لیتے ہیں۔ پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھ سے

---

[1] دیکھیے اس آیت کے تحت تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، روح المعانی، المنار، القاسمی وغیرہ

عما کتبت ایدیھم وویل لھم مما یکسبون ○
(نمبر ۷۸-۷۹)

کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اس ذریعہ سے وہ کچھ پیسے کما لیں۔ پس جو کچھ ان کے ہاتھوں نے لکھا ہے اس کی وجہ سے ان کے لیے ہلاکت ہے اور جو کچھ انھوں نے کمایا ہے اس کی وجہ سے ان کے لیے بربادی ہے۔

ملاحظہ فرمایئے تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ ان آیات میں ان یہود کا ذکر کیا گیا ہے جو دعویٰ تو یہ کرتے تھے کہ ہم اہل کتاب ہیں، مگر حالت یہ تھی کہ اصل کتاب الٰہی کا جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی ان کو خاک علم نہیں تھا۔ چند من مانی باتیں تھیں جن پہ یہ لوگ ایمان رکھتے تھے اور ان کا سرچشمۂ علم ان کا ظن تھا۔ پھر لوگوں کو دھوکہ دینے اور ان سے مالی منفعت حاصل کرنے کی غرض سے اپنی من مانی باتوں کو اپنے ہاتھ سے لکھ لیتے اور ناواقف لوگوں کے سامنے انھیں پیش کر کے کہتے: دیکھو یہ ہے کتاب الٰہی۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے مکر و فریب کا پردہ چاک کر کے ان کی اصل حقیقت بے نقاب کرتا ہے، تاکہ لوگ ان کے فریب کا شکار نہ ہوں۔ غور کرنا چاہیے کہ ان آیات سے بھی کس قدر واضح طریقہ پر معلوم ہوتا ہے کہ امیت کا دار و مدار کتابت سے ناآشنا ہونے پر نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ نوشت و خواند تو جانتے تھے اور اس بنا پر قرآن کی تصریح کے مطابق یہ من مانی باتیں اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ بلکہ امیت کا اصل وصف امتیازی اور اس کا حقیقی مفہوم کتاب الٰہی کا علم نہ ہونا ہے۔ خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ سرے سے ان کو اس کا علم ہی نہ ہو یا علم تو ہو مگر یہ اس کا اخفا کرتے ہوں یا اس میں تحریف و تاویل باطل سے کام لیتے ہوں۔ فن بلاغت کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ان دونوں صورتوں پر عدم علم کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری ج ۲ ص ۲۵۹

"فکتبوا کتاباً بایدیھم ثم قالوا لقوم سفلة جھال: ھذا من عند اللہ ثم سماھم امیین، لجحودھم کتب اللہ ورسولہ!"[1]

یہ (چند یہود) اپنے ہاتھ سے ایک نوشتہ لکھتے تھے اور پھر جاہل اور بے خبر لوگوں سے کہتے تھے: یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے۔ ان لوگوں کو امیین اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کی کتابوں سے سرکشی کرتے تھے۔

حضرت مجاہد جو مشہور تابعی مفسر ہیں ان سے بھی یہی منقول ہے۔ فرماتے ہیں:

"ان الامیین الذین وصفھم اللہ بما وصفھم بہ فی ھذہ الآیة، انھم لا یفقھون من الکتاب الذی انزلہ اللہ علی موسیٰ شیئاً، ولکنھم یتخرصون الکذب ویتقولون الا باطیل کذباً وزوراً!"[2]

بے شبہ امیین جن کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کے اوصاف کے ساتھ بیان کیا ہے وہ لوگ ہیں؛ جو حضرت موسیٰ پر اللہ نے جس کتاب کو نازل کیا تھا اسے کچھ نہیں سمجھتے تھے بلکہ غلط سلط اور جھوٹ اور لغو باتوں کے ہوائی تیر چلاتے تھے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو لوگ کتاب الٰہی کا علم نہیں رکھتے ان کے لیے امیون کی اصطلاح خود قرآن کی ایجاد کردہ نہیں ہے، بلکہ یہودیوں کی ہے۔ یہ لوگ اپنے اہل کتاب ہونے کے زعم میں سمجھتے تھے کہ وہ اللہ کا ایک منتخب برگزیدہ و ممتاز گروہ ہیں جیسا کہ قرآن میں بھی ان کے اس زعم باطل کی طرف جابجا اشارے ہیں۔ اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ جو کتاب اور رسول سے ناآشنا تھے ان کو یہود امیین کہتے تھے جس کے معنی ان کے ہاں الغربا تھے۔[3] ڈاکٹر جواد علی لکھتے ہیں:

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری ج ۲ ص ۲۵۹

[2] تفسیر ابن جریر ص ۶۶۲

[3] المشرق جزء تشرین الثانی ۱۹۳۱ ص ۸۲۰

یہود اپنے عرب پڑوسیوں کو امیون کہتے تھے اور اس سے مراد وہ لوگ نہیں تھے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے. جیسا کہ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں بلکہ یہ (یہود) اس لفظ کو ٔ ٔم "کوبیم" یا "جوییم" بہ معنی الغربا کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے. یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ خدا نے ان کو وحی، نبوت اور انبیا سے سرفراز کیا ہے اس لیے یہ ایک منتخب گروہ ہیں۔ ان کے برخلاف دوسرے لوگ ان چیزوں سے محروم ہیں اس لیے وہ غربا ہیں .... اور اس لفظ کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو یہودی نہیں ہوتا تھا۔ پس یہ لفظ امی عبرانی زبان کے لفظ گوی (GOI) کا مترادف اور یونانی زبان کا لفظ (ETHNOS) کے مقابل ہے[1]۔"

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اب اس کی روشنی میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت جس میں حضور کی بعثت فی الامیین کا تذکرہ ہے پڑھیے تو اس کا مطلب اس معنی و مفہوم سے مختلف نکلتا ہے جو اب تک عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، آیت یہ ہے:

"هوالذی بعث فی الامیین رسولًا منهم یتلوا علیهم آیته ویزکیهم ویعلمهم الکتب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین"

(الجمعة ۲:۳)

یہ وہ خدا ہے جس نے امیون میں سے ایک رسول کو مبعوث فرمایا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ اس سے پہلے یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی ایک نشانی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بطور ایک دلیل نبوت کے بیان فرماتا ہے کہ دیکھو، حضور کی ولادت، نشوونما اور بعثت عرب کے ان لوگوں میں ہوئی جو نہ کتاب الٰہی کا علم رکھتے تھے اور نہ کسی پیغمبر اور وحی سے آشنا تھے اور اس بنا پر کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے یعنی نہ خدا کو جانتے تھے، نہ روز حشر کو مانتے

---

[1] تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۶ ص ۹۶

تھے، پتھر جیسی بیجان چیزوں کو اپنا معبود یقین کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ بیشک اس زمانہ کے یہود اور نصاریٰ بھی گمراہ اور صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے تھے۔ مگر ان کی گمراہی اس درجہ کی نہیں تھی، وہ خدا، کتاب الٰہی، پیغمبر اور وحی سے تو آشنا تھے۔ قرآن مجید کو بغور پڑھئے تو صاف نظر آئے گا کہ "ضلال مبین" کے الفاظ مشرکین کے لیے ہی استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے برخلاف جب وہ اہل کتاب کو خطاب کرتا ہے تو کہتا ہے:

"تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم" آؤ تم اس کلمہ کی طرف جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے۔

پھر ان کی صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ کتاب اللہ کی تلاوت بھی کرتے اور پیغمبروں پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔ غرض کہ اس آیت میں "لفی ضلال مبین" بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ (امیین) وہ لوگ ہیں جو کچھ جانتے ہی نہیں اور کسی بات کا بھی علم نہیں رکھتے اللہ کی یہ شان ہے کہ وہ ایسے ہی لوگوں میں ایک پیغمبر مبعوث کرتا ہے جو ان کو کتاب وحکمۃ کی تعلیم دیتا اور تطہیر نفس کرتا ہے، ورنہ قرآن میں بہت سی باتیں توراۃ وانجیل اور کتب قدیمہ کی ہیں۔ شام کے سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات تھوڑی سی دیر کے لیے بحیریٰ راہب سے ہوگئی تھی تو اس کا تو بدزبانوں اور دشمنوں نے بہ فضیحتہ کیا۔ اگر کہیں آپ اہل کتاب میں پیدا ہوجاتے اور ان لوگوں کے درمیان آپ کی نشوونما اور تربیت ہوتی تو پھر خدا جانے کیا کچھ نہیں کہتے۔ پس اللہ کی آیت اور حضور کی نبوت کی دلیل یہ ہے کہ کتاب اور رسول کا علم نہ رکھنے والی قوم میں پیدا ہوئے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دی۔ اس چیز کا ہرگز اس سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا نہیں اور نہ یہ چیز ایسی ہے کہ اس کو بطور معجزہ پیش کیا جائے۔ دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو نوشت وخواند سے عاری ہونے کے باوجود نہایت عقلمند، بڑے فرزانہ اور اعلیٰ درجہ کے مدبر اور سیاست داں ہوئے ہیں۔ ہم نے خود بعض ایسے لوگ دیکھے ہیں جو ایک حرف لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے اور اس کے باوجود بہترین قسم کے شاعر تھے۔ اس بنا پر ایک ناخواندہ انسان کا معجزہ یہ ہوگا کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے ایک کتاب لکھ کر آپ کو دے دے یا یہ ہوگا کہ وہ حکمت کی باتیں آپ کو بتائے؟

قرآن میں اسی حقیقت کو جو ہم نے بیان کی ہے واضح کرنے کے لیے فرمایا گیا:

"وما کنت تتلوا من قبلہ من کتٰب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون"

(العنکبوت ۴۸)

اور آپ اس سے پہلے نہ کسی کتاب کی تلاوت کرتے تھے اور نہ اس کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو بیشک اہل باطل شک کرتے۔

مفسرین عام طور پر اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ امیت کے معنی لکھ پڑھ نہ سکنا ہیں حالانکہ جیسا کہ اور بیسیوں[1] آیات میں کتاب کا لفظ نکرہ لایا گیا ہے۔ یہاں بھی کتاب سے ہر کتاب یا نوشتہ نہیں بلکہ صرف کتاب الٰہی مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ آپ کی بعثت ان لوگوں میں ہوئی تھی جو کتاب کا علم نہیں رکھتے تھے اس لیے آپ نبوت سے پہلے نہ کسی کتاب سماوی کی تلاوت کرتے تھے اور نہ اس کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر بیشک اہل باطل شک کر سکتے تھے۔ اس آیت میں مطلق قرأت اور کتابت کی نہیں بلکہ خاص کتاب الٰہی کی تلاوت اور اس کی کتابت کی نفی کی گئی ہے چنانچہ اس آیت کا سیاق و سباق جس میں اہل کتاب اور ان کی کتابوں اور قرآن کا تذکرہ ہے، اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے علاوہ بریں اسی مضمون کو ایک اور آیت میں بھی بیان کیا گیا ہے جس کو دیکھ کر یہ بات بالکل یقینی ہو جاتی ہے کہ یہاں مطلق قرأت و کتابت کی نفی ہرگز مراد نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ما کنت تدری ما الکتٰب ولا الایمان"

(شوریٰ ۵۲)

آپ نہ کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو

اس آیت میں کتاب کا معرف باللام ہونا اور الایمان کے ساتھ اس کا مذکور ہونا اس بات کی برہان قاطع ہے کہ کتاب سے مراد کتاب الٰہی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سورۂ عنکبوت کی آیت میں جو کتاب کا لفظ

---

[1] مثلاً سورۃ الاحقاف کی آیت "ائتونی بکتٰب من قبل ھذا او اثٰرۃ من علم" میں کتاب سے مراد کتاب اللہ اور علم سے مراد علم انبیاء ہے۔

ہے اس سے مطلق کتاب نہیں بلکہ کتاب خاص مراد ہے، کیونکہ "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" کا اصول اسی قسم کے مواقع کے لیے ہے۔ اب مزید غور کیجیے تو سورۂ عنکبوت کی آیت سے مطلق کتابت کی نفی تو کیا ثابت ہوتی اور الٹا حضور کے لیے نفس کتابت کا ثبوت ملتا ہے۔ منطق کا مشہور مسلمہ ہے کہ سلب موضوع نفس وجود موضوع کا متقاضی ہوتا ہے۔ جب یہ فرمایا گیا کہ آپ کسی کتاب الٰہی کی کتابت نہیں کرتے تو اس سے ضمناً اس پر دلالت ہوگئی کہ آپ کتابت کرسکتے تھے۔ ایک نابینا سے یہ کبھی نہیں کہا جاسکتا کہ تم نے تاج محل کبھی نہیں دیکھا؟ چنانچہ بخاری کی واقعہ حدیبیہ والی روایت جس پر ہم گفتگو کرچکے ہیں اس کے علاوہ بھی متعدد روایات ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور صرف کتابت سے آشنا ہی نہیں تھے بلکہ اس فن کے رمز دان و نکتہ شناس بھی اس درجہ کے تھے کہ امیر معاویہ جیسے مشہور کاتب کو بعض اوقات ہدایت فرماتے تھے کہ دیکھو "ب" کو سیدھا کرو۔ "س" کے دندانے بناؤ۔ "م" کو ٹیڑھا مت کرو اور "بسم اللہ" کو زیادہ مت کھینچو۔[1]

جمہور علماء جو امیت کے عام متداول اور مشہور معنی مراد لیتے ہیں ان کا سب سے بڑا استدلال سورۂ عنکبوت کی اسی آیت سے ہے جس پر ہم نے ابھی کلام کیا۔ اب ہم ان روایات پر گفتگو کریں گے جن سے امیت کے اس معنی پر استدلال کیا جاتا ہے۔

(۱) صحیح بخاری کے بالکل شروع میں باب بدء الوحی کے ماتحت جو مشہور حدیث ہے اس میں ہے کہ جب فرشتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غار حرا میں آیا تو اس نے کہا: "اقراء" (پڑھ)۔ آپ نے فرمایا: "ما انا بقارئ" (میں قاری نہیں ہوں)۔ اب فرشتہ آپ سے چمٹ گیا اور پھر اس نے وہی اقرأ کہا اور آپ نے دوسری مرتبہ بھی وہی جواب دیا، یہاں تک کہ تیسری بار فرشتہ نے کہا: "اقرأ باسم ربک الذی الآیۃ" تو حضور نے اس کو جس طرح سنا تھا اسی طرح دھرایا۔ اس روایت میں حضور کے ارشاد "ما انا بقارئ" سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے کہ آپ کو قرأت نہیں آتی تھی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات جو پیش نظر رکھنی چاہیے یہ ہے کہ جس طرح ہماری زبان

---

[1] حافظ ابن حجر نے (فتح الباری ج ۷، ص ۴۰۶) قاضی عیاض کے حوالہ سے یہ آثار نقل کیے ہیں۔

اردو میں پڑھنے کے دو معنی آتے ہیں ایک کسی کتاب کسی مضمون یا کسی تحریر کا پڑھنا اور دوسرے زبانی یاد سے کچھ سنانا مثلاً ہم کہتے ہیں اس بچے نے ایک نظم پڑھی۔ انگریزی زبان میں پہلے معنی کے لیے To Read اور دوسرے معنی کے لیے To Recite کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح عربی میں لفظ قرأت بھی ان دو معنوں میں مشتمل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جب فرشتہ نے حضور سے "اقرأ" کہا تو اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ فرشتہ آپ سے کسی لکھی ہوئی چیز کے پڑھنے کی درخواست کر رہا تھا۔ اس بنا پر "اقرأ" سے یہاں مراد اردو میں زبانی پڑھو یا سناؤ ہی ہو سکتی ہے اور اس کا قرأت بہ معنی کتاب پڑھنے سے کوئی تعلق ہرگز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں اس میں اختلاف ہے کہ "ما انا بقاریٔ" میں ما کا لفظ نافیہ ہے یا استفہامیہ اگرچہ عام رجحان یہی ہے کہ نافیہ ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی اس کو ہی ترجیح دی ہے لیکن اس موقع پر بعض روایات میں "ما انا بقاریٔ" کے بجائے "کیف اقرأ" (میں کیوں کر پڑھوں) اور "ماذا اقرأ" (میں کیا پڑھوں) کے الفاظ منقول ہیں اور بقول حافظ ابن حجر کے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بخاری کی اس روایت میں ما نافیہ نہیں بلکہ استفہامیہ ہے[1]۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب تک فرشتہ صرف "اقرأ" کہتا رہا آپ اپنے الفاظ دہراتے رہے لیکن جونہی فرشتہ نے آیت پڑھی آپ نے اس کو زبان مبارک سے ادا فرما دیا۔

(۲) ان حضرات کا دوسرا استدلال حدیث ذیل سے ہے:

"نحن امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب[2]" ہم امی لوگ ہیں، نہ کتاب جانتے ہیں اور نہ حساب۔

یہ روایت صحیح بخاری، مسلم، نسائی اور مسند احمد بن حنبل سب میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے اور روزہ سے متعلق ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں ماہ و سال کی تعیین کے لیے کوئی خاص تقویم یا جنتری مروج نہیں تھی کچھ لوگ

---

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۱۹

[2] صحیح بخاری کتاب الصوم باب قول النبی لا نکتب ولا نحسب

تقویم شمسی پر عمل کرتے تھے اور کچھ لوگ تقویم قمری پر۔ اسلام میں جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو اب یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ مہینہ اور اس کے دنوں کی تعیین کس طرح کی جائے؟ اہل کتاب کے ہاں تقویم شمسی کا رواج تھا۔ لیکن اس میں دقت یہ تھی کہ اس میں باقاعدہ حساب کتاب رکھنا پڑتا تھا اور باقاعدہ عمل وہیں ہو سکتا تھا جہاں دفتری نظم و نسق کا اہتمام کیا جاتا ہو۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام سہولت اور آسانی کے پیش نظر قمری تقویم کو اختیار فرما لیا۔ اور ارشاد ہوا: سیدھی سی بات ہے، چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو۔ اس میں مصلحت یہ بھی تھی کہ رمضان کا مہینہ ہمیشہ کسی ایک موسم میں نہ آئے بلکہ ادلتا بدلتا رہے۔ اب اس پس منظر کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو حدیث کے الفاظ کا ٹھیٹ اردو ترجمہ یہ ہوگا کہ "ہم لوگ امی ہیں حساب کتاب نہیں رکھتے۔" یہاں اصل مقصد بیان کرنا حساب کا ہے جس سے مراد تاروں کی نقل و حرکت (تسییر نجوم) کا حساب ہے اور کتاب کا لفظ محض تابع غیر مقصود کی حیثیت سے مستعمل ہوا ہے جیسا کہ اس قسم کے موقع پر اردو میں بھی ہوتا ہے۔ اس سے نفس کتابت دانی کی نفی پر کہاں دلالت ہوئی؟ چنانچہ حافظ ابن کثیر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"نحن امة امية ... ای لا نفتقر فی عبادتنا ومواقیتها الی کتاب وحساب"[2]	ہم ایک امت امیہ ہیں یعنی اپنی عبادت اور اس کے اوقات میں ہم کو حساب کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔

رہ گیا حدیث میں امیۃ کا لفظ! تو ایک نکتہ دان بلاغت جانتا ہے کہ اس جگہ یہ لفظ بطور صفت تجریبہ کے استعمال ہوا ہے یعنی امی دراصل وہ لوگ ہیں جو کتاب الٰہی کا علم نہیں رکھتے۔ حضور نے یہاں اس لفظ کو مطلق کتاب سے آشنا نہ ہونے یا بالفاظ دیگر صاف سپاٹ سیدھے سادے ہونے کے معنی میں استعمال فرمایا ہے۔ یہ صرف بلاغت کا ایک اسلوب بیان ہے نہ کہ کسی چیز کا مدار حکم!

(۳) ایک اور روایت ہے جو ابی بن کعب سے مروی ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] تاریخ العرب قبل الاسلام جلد ۵ ص ۲۴۴

[2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۷۰

علیہ وسلم جبریل سے ملے اور فرمایا:

"یا جبریل! انی بعثت الی امۃ امیین منھم العجوز والشیخ الکبیر والغلام والجاریۃ والرجل الذی لم یقرأ کتابا قط۔ قال: یا محمد ان القرآن انزل علی سبعۃ احرف"[1]

اے جبریل! میں امی لوگوں میں مبعوث کیا گیا ہوں۔ ان میں بوڑھی عورتیں بھی ہیں اور بوڑھے مرد بھی۔ لڑکے بھی ہیں اور لڑکیاں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے۔ جبریل نے کہا: اے محمد! بے شبہ قرآن سات احرف (یعنی قراءات) پر نازل کیا گیا ہے۔

اس روایت میں "الرجل الذی لم یقرأ کتاباً" سے یہ حضرات استدلال کرتے ہیں کہ امیت کے معنی قرات وکتابت سے ناآشنا ہونا ہیں۔ لیکن ادنی تامل سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہاں بھی قرات سے مراد زبانی کسی چیز کا پڑھنا ہے نہ کہ کسی کتاب کو دیکھکر پڑھنا! اور حضور کا مطلب یہی ہے کہ میں پیدا تو ان لوگوں میں ہوا ہوں جو کسی کتاب الٰہی سے آشنا نہیں اور اس لیے اس کی تلاوت کے آداب و رسوم کیا ہیں؟ اس کے بعض خاص مصطلحات اور الفاظ کا تلفظ کس طرح ہونا چاہیے؟ ان چیزوں سے وہ واقف ہی نہیں، چنانچہ جبریل نے جو جواب دیا وہ اسی چیز سے متعلق تھا۔ انھوں نے کہا: قرآن میں تو سات قراتیں ہیں۔ اگر ان میں کچھ لوگ ایک قرات سے الفاظ ادا نہیں کرسکیں گے تو دوسری قرات سے کریں گے۔ اس میں کوئی بات تشویش کی نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس تشریح کے ماتحت قرات وکتابت بہ معنی نوشت وخواند کا اس حدیث میں کوئی تذکرہ نہیں کہ اس سے امیت کے اس معنی زیر بحث کے لیے استدلال کیا جاسکے۔

قرآن مجید میں ایک اور جگہ امیین کا لفظ آیا ہے اور وہاں بھی اہل کتاب کے مقابل کی حیثیت سے ان کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

"ومن اھل الکتٰب من ان تامنہ بقنطار یؤدہ الیک ومنھم من ان تامنہ

اور اہل کتاب میں لوگ بعض تو ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کے پاس (روپیوں کا) ایک ڈھیر

---

[1] جامع الترمذی کتاب ابواب القراءات باب ماجاء انزل القرآن علی سبعۃ احرف

بدینار لا یؤدہ الیک الا مادمت علیہ قائماً ذالک بانھم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل ویقولون علی اللہ الکذب وھم یعلمون"

(آل عمران آیت ۷۵)

بھی امانت رکھدیں تو وہ آپ کو لوٹا دیں گے اور بعض ان میں ایسے ہیں کہ اگر آپ ایک دینار بھی ان کے پاس امانت رکھیں گے تو جب تک آپ ان کے سر پر ہر وقت کھڑے ہی نہ رہیں وہ نہ لوٹائیں گے۔ ان کا یہ طرز عمل اس لیے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ امیون کا ہم پر کوئی بس نہیں چلتا اور یہ لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں درآنحالیکہ (جو بات حق ہے اسے) یہ خود جانتے ہیں۔

غور کیجئے! اس آیت سے کس طرح صاف ظاہر ہے کہ اہل کتاب اپنے علاوہ عرب کے تمام لوگوں کو امیون کہتے تھے۔ اور کتاب الٰہی وغیرہ سے چونکہ یہ لوگ آشنا نہیں تھے اس لیے ان کو اس درجہ حقیر و کم مایہ سمجھتے تھے کہ بدعہدی اور خیانت کا ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی ان کو باک نہیں ہوتا تھا جس پر خدا نے ان کو تنبیہ کی۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ ہمارے مفسرین میں بھی بعض حضرات اس حقیقت سے باخبر تھے چنانچہ صاحب تفسیر "المنار" سید رشید رضا لکھتے ہیں:۔

"وکان اھل الکتاب یسمون العرب بالامیین ولعلہ کان لقباً[1] لاھل الحجاز ومن جاورھم دون اھل الیمن"

اور اہل کتاب نے عربوں کا نام امیین رکھ چھوڑا تھا اور غالباً یہ یمن کے لوگوں کو مستثنیٰ کر کے حجاز کے لوگوں اور ان کے پڑوسیوں کا لقب تھا۔

جیسا کہ گزر چکا ہے امی لفظ کی اصل کیا ہے؟ اس سلسلے میں متعدد اقوال نقل کیے جاتے ہیں لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر یہ لفظ خالص عربی ہے اور کسی عبرانی لفظ سے اس کا پیوند نہیں ہے تو یہ ام القریٰ سے بنایا گیا ہے اور امی اب وہ لوگ ہوئے جو ام القریٰ یعنی مکہ کے رہنے والے تھے اور بعض حضرات نے یہ لکھا بھی ہے کہ اس صورت میں امیون میں وضع لغوی کے اعتبار سے

---

[1] جلد ۹ ص ۲۲۴

تو منقانی نسبت ہوئی مگر ان کی خصوصیت وہی کتاب الہی کا علم رہی جس کے باعث یہود ان کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے۔

قرآن بے شبہ عالم انسانیت کا ایک عظیم معجزہ ہے جس کا ظہور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہوا ہے۔ اور یہ دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، معنی و مطلب کے اعتبار سے اور الفاظ و نظم کلام کے اعتبار سے بھی پہلی حیثیت کو اس طرح واضح کیا گیا کہ سورہ الاعراف کی دو آیتوں میں یکے بعد دیگرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت "الامی" بھی بیان کی گئی ہے یعنی ایک ایسا پیغمبر جس کے نہ خاندان میں اور نہ عزیزوں قریبوں میں کوئی پیغمبر تھا، جو نہ خود کتب الہیہ سے واقف تھا، اور نہ جس کی پیدائش اور تربیت کتب الہیہ کا علم رکھنے والے لوگوں میں ہوئی تھی۔ پھر اس کی زبان سے علوم اولین و آخرین کے حقائق بیان ہوتے ہیں۔ تو غور کرو یہ کیونکر ہوتے ہیں؟ اور ان سب کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اہل کتاب کو خصوصاً اور دوسروں کو عموماً اس پر حیرت و استعجاب ہو سکتا تھا کہ ایک امی کی زبان سے کتب الہیہ قدیمہ کے حقائق کیوں کر بیان ہو رہے ہیں تو قرآن نے کہا اس پر حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ یہ امی پیغمبر ہے اور تم لوگوں کے لیے اس لیے اجنبی نہیں ہے کہ خود تمہاری کتابوں میں اس کا ذکر اور اس کے آنے کی بشارتیں مرقوم موجود ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

"الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التوراۃ والانجیل" (۱۵۸)	وہ لوگ جو اس امی رسول و نبی کا اتباع کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں

توراۃ و انجیل کی ان بشارتوں کا تذکرہ بہت سی کتابوں میں ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس پر سب سے زیادہ جامع کتاب مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی "اظہار الحق" ہے۔ سید رشید رضا نے بھی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں متعدد صفحات میں مولانا کیرانوی کی اسی کتاب کے حوالے سے بشارات نقل کی ہیں ان میں ایک بشارت ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت اور بعثت فی الامیین کی طرف بھی اشارہ ہے۔ چنانچہ صاحب "المنار" نے اس کی تشریح میں قرآن مجید کی آیت "ھو الذی بعث فی الامیین" نقل بھی کی ہے۔ وہ بشارت جو کتاب استثنا کے باب ۳۲ کی اکیسویں آیت ہے حسب ذیل ہے

"خدا نے کہا کہ ان لوگوں نے غیر خدا کو خدا مان کر اور اپنے معبودات باطلہ میں الجھ کر میری

غیرت کو بھڑکایا اور مجھ کو غصہ دلایا ہے تو میں بھی اس کا بدلا ان لوگوں کے ذریعہ لوں گا جو "غیر شعب" ہوں گے اور جاہل طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں گے۔"

سید رشید رضا کہتے ہیں کہ یہود اپنے آپ کو "شعب" کہتے تھے اور اپنے علم پر مغرور تھے اس لیے "غیر شعب" اور "جاہل طبقہ" سے وہی لوگ مراد ہیں جن کو قرآن "امیین" کہتا ہے[1]۔

بس گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت امیت قرآن مجید کے باعتبار معانی و مطالب معجزہ و کلام الہی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اب رہا قرآن کا باعتبار زبان و الفاظ معجزہ ہونا! تو اس کو اس طرح بیان فرمایا گیا۔

"ولقد نعلم انھم یقولون انما یعلمہ بشر لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی و ھذا لسان عربی مبین" (النحل آیت ۱۰۳)

اور ہم جانتے ہیں یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان (محمد) کو ایک شخص سکھاتا ہے مگر جس کی طرف یہ تعلیم کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے۔

مکہ میں ایک غلام تھا اس کے نام کے بارہ میں اختلاف ہے۔ عبد اللہ بن عباس بلعام بتاتے ہیں اور عکرمہ یعیش۔ اس کے علاوہ بعض حضرات نے جبر اور ابو فکیہہ بھی نام بتائے ہیں۔ بہرحال حضور کا اس کے یہاں آنا جانا تھا۔ یہ شخص کچھ لکھا پڑھا تھا، اس لیے دشمنوں نے کہنا شروع کردیا کہ یہ غلام آپ کو تعلیم دیتا ہے۔ خدا اس تہمت و الزام کی تردید کرتا ہے تو معانی و مطالب کے لحاظ سے قرآن کے کلام الہی ہونے کو حضور کی صفت امی کے ذریعہ بیان کر ہی چکا تھا۔ صرف زبان اور الفاظ کا معاملہ رہ گیا تھا۔ اسے اس آیت میں صفائی کے ساتھ بیان کردیا گیا کہ اس شخص کی زبان اعجمی غیر فصیح ہے اور یہ عربی مبین ہے جس کی ایک سورت کیا ایک آیت کا مثل بھی عرب کے بڑے بڑے نامور متحدہ سعی و کوشش کے باوجود پیدا نہیں کرسکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت امی کے جو معنی ہم نے متعین کیے ہیں یعنی کسی کتاب الہی کا علم نہ ہونا، قرآن مجید میں اسی کو ایک مقام پر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

---

[1] تفسیر المنار ج ۹ ص ۲۵۹

ووجدک ضالاً فہدیٰ ۔ (والضحیٰ) اور خدانے آپ کو ضال پایا تو ہدایت دی۔

مفسرین کو اس آیت کی تفسیر میں بڑا اشکال پیش آیا ہے لیکن بات بالکل صاف اور ظاہر ہے۔ آپ کی بعثت جن لوگوں میں ہوئی وہ "امیین" تھے اور آپ "امی" تھے۔ قرآن کی تصریح کے مطابق یہ "امیین" بعثت محمدی سے قبل ضلال مبین میں تھے تو حضور بھی خلعت نبوت سے سرفراز ہونے سے پہلے "ضال" تھے۔ نبوت سے پہلے کتاب الٰہی کے عدم علم میں عرب کے یہ امیین اور حضور دونوں برابر تھے اس لیے "ضلال" کا اطلاق دونوں پر ہوا مگر امیین اس سے آگے بڑھ کر رذایل اعمال، اخلاق فاسدہ اور شرک و بت پرستی میں بھی مبتلا تھے اس لیے ان کا یہ "ضلال" ضلال مبین تھا اور ان کے برخلاف حضور نبوت سے پہلے بھی ان تمام چیزوں سے مبرا و منزہ تھے اس لیے قرآن میں عدم علم کتاب الٰہی کی وجہ سے آپ کو صرف "ضال" کہا گیا۔

اس مضمون میں صرف امی اور امیون کے صحیح معنی و مفہوم کو متعین اور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بس۔ رہی یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنا پڑھنا آتا تھا یا نہیں؟ ہم کو نہ اس پر اصرار ہے اور نہ اس سے انکار کیونکہ رسمی طور پر چند حروف کی شکل و صورت اور ان کے پیچ و خم سے آشنا ہونا یا نہ ہونا فی نفسہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کسی انسان کے لیے کوئی بڑا معیار کمال و نقص بن سکے۔ اصل چیز دماغ روشن، دل بیدار اور حساس و دراک ذہن ہے۔

آٹھویں صدی ہجری کے

اندلسی شعرا کا ایک تذکرہ

سلاطین غرناطہ (بنو احمر) کا مشہور وزیر، ذوالوزارتین لسان الدین[1] بن الخطیب السلمانی (۷۱۳-۷۷۶ھ) نہ صرف سیاسی نقطۂ نگاہ سے بلکہ علوم و فنون کی سرپرستی اور اپنے تاریخی و ادبی آثار کے اعتبار سے بھی ہماری تاریخ کی شخصیات بارزہ میں سے ہے۔ وہ اپنے وقت کا بے نظیر انشا پرداز، معجزہ نگار شاعر اور نکتہ سنج ادیب تھا۔ طب و فلسفہ میں بھی اس کا مطالعہ ہمہ گیر و محققانہ تھا، طب میں الوصول لحفظ الصحۃ فی الفصول اس پایہ کی تصنیف تھی کہ اس کے متعلق خود ہی بیباختہ کہتا ہے لم یولف مثلہ فی الطب۔ تاریخ و تراجم میں اس کے قلم سے جتنی کتابیں نکلیں ان میں سے الاحاطۃ اور اللمحۃ البدریۃ وغیرہ اب رواج پذیر ہو چکی ہیں۔ اور ان کتابوں کو دیکھنے کے بعد یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ابن الخطیب کی ان تاریخی و ادبی تصانیف کے بغیر غرناطہ کی علمی،

---

[1] حالات کے لیے ملاحظہ ہو: ابن خلدون ج ۷ ص ۳۳۲-۳۳۶، ص ۳۴۱ (طبع ۱۲۸۴ھ بولاق)؛ ابن حجر الدرر الکامنۃ ج ۳ ص ۴۶۹-۴۷۴ (حیدرآباد)؛ نفح الطیب ج ۳ و ۴؛ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: ج ۲ ص ۳۹۷ (مضمون نگار: C. F. Seybold)؛ فلپ حتی، History of The Arabs; CH. XL. PAR؛ فہرست بروکلمان ج ۲ ص ۳۳۷-۳۴۰، ایضاً ضمیمہ ج ۲ ص ۳۷۲-۳۷۳ طبع ۱۹۴۹ معجم المطبوعات العربیۃ (سیرکیس) ۱۵۸۸-۱۵۸۹ وغیرہ۔

ادبی و ثقافتی تاریخ کے اہم ابواب یقیناً ہماری نظروں سے اوجھل رہتے۔ ملوک بنی احمر کی تاریخ میں ابن الخطیب سے زیادہ موثق اور کون ہو سکتا ہے جو خود وزارت عظمیٰ کے منصب پر سرفراز رہ چکا ہے۔ آٹھویں صدی کے اندلسی علماء، ادباء، شعراء اور ارباب دول کے حالات اور ان کی علمی ثقافتی سرگرمیوں کی صحیح تصویر ابن الخطیب ہی کے آثار قلم میں مل سکتی ہے۔

ابن الخطیب آٹھویں صدی کے مصنفین کی صف میں نہایت ممتاز و بلند پایہ مصنف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی جملہ تصانیف جن کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے ان میں سے ایک تہائی کتابیں آج بھی موجود ہیں۔ تصنیف و تالیف سے اتنا شغف تھا کہ زندگی کے سب سے زیادہ پر آشوب دور میں بھی جب کہ مخالفوں کی ریشہ دوانیوں سے بسیط ارض اس کے لیے تنگ ہو رہی تھی، اس کا اشہب قلم برابر مصروف خرام رہا چنانچہ المباخر الطعمیۃ فی المفاخر الخطیبیۃ، خلع الرسن اور اعلام الاعلام[1] اسی دور کے نقوش ہیں ایک اور تصنیف جو غرناطہ سے منتقل ہونے کے بعد ترتیب پائی الکتیبۃ الکامنۃ کے نام سے موسوم ہے۔ ذیل میں اسی کتاب کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے آٹھویں صدی کے اندلسی شعراء کے مختصر حالات اور ان کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ یہ تذکرہ عربی ادبیات کی تاریخ میں اس لحاظ سے نہایت قیمتی سرمایہ ہے کہ اس کے ذریعہ ایک مخصوص عہد کے اندلسی شعراء کا تعارف ابن الخطیب جیسے جلیل القدر ادیب و شاعر کی زبان قلم سے حاصل ہوتا ہے۔ جو ان سے ذاتی طور پر واقف اور ان کے فضل و کمال کا شاہد عینی ہے الاحاطۃ، نفح الطیب اور بعض دوسری تصانیف کے ذریعہ اس عہد کے شعراء کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ لیکن الکتیبۃ کو شعراء کا مخصوص تذکرہ ہونے کے لحاظ سے مستقل اہمیت حاصل ہے۔

الکتیبۃ کا پیش نظر نسخہ پہلے کلکتہ کے مشہور مفتی اور مدرسہ عالیہ کے جلیل القدر مدرس مولانا سید محمد عمیم الاحسان مجددی کی ملکیت تھا اب یہ ادبی سرمایہ ان کے ایک تلمیذ رشید مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی کی ملکیت ہے۔ اس کے علاوہ ایک نسخہ پیرس کے کتب خانہ[2] (Biblio Theque National

---

[1] نفح الطیب: ۹۸۳

[2] فہرست پیرس بابت ۱۸۸۳–۱۹۲۴ء مرتبہ E. Blochet

میں تحت رقم (۵۷۹۴) محفوظ ہے۔ پیرس کا مخطوطہ بخط نسخ مغربی اکیس پندرہ اوراق کے ایک مجموعہ میں (ورقہ ۱۵ اب۔ ورقہ ۱۱۵) سترھویں یا اٹھارویں صدی مسیحی کا لکھا ہوا ہے، اس کتاب کے ایک اور نسخے کا ذکر ڈاکٹر ای۔ ڈی روس، مکتبۂ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی سالانہ رپورٹ[1] بابت ۵-۱۹۰۶ء میں سوسائٹی کی خرید کردہ عربی و فارسی مخطوطات کی فہرست میں کرتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اب تک یہ نسخہ ہمیں دستیاب نہ ہوسکا۔

پیش نظر نسخہ اکیس اوراق میں (ورقہ اب۔ ورقہ ۱۱۹) ختم ہوتا ہے۔ ہر صفحہ میں اٹھارہ سطریں ہیں۔ تاریخ کتابت اور کاتب کا نام موجود نہیں۔ لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ یہ تقریباً ڈیڑھ دو سو برس پیشتر کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا خط جوہر یعنی مغربی مراکشی ہے۔ جو بلاد مشرق میں رواج پذیر نہ ہونے کی وجہ سے مشرقی علماء کے لیے غیر مانوس و مشکل رہا ہے۔ چنانچہ شیخ ابراہیم بن احمد الباعونی کو بھی اس خط کی صعوبت کی شکایت تھی۔ بلکہ وہ تو خود ابن الخطیب کے خط کو مشکل کہتے تھے۔ حالانکہ بہ قول علامہ مقری ابن الخطیب کا خط اہل مغرب کی نظر میں محمود و قابل ستائش ہے۔ اس مخطوطہ کے ہر صفحہ کی ابتدا وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمدٍ وآلہ وصحبہ وسلم بالالتزام ہوتی ہے اور اس سے ہمیں کاتب کے متعلق صرف اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پختہ قسم کا مذہبی آدمی ہوگا۔ کتاب کے جملہ عنوانات سرخ روشنائی سے مرقوم ہیں۔ صفحہ اوّل کی ابتدا میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی احمری ہے:۔

"قال الشیخ الفقیہ الماجد ابو عبد اللہ محمد بن الخطیب السلمانی رحمہ اللہ تعالےٰ ورضی عنہ"

فقہ کا لفظ جس مشہور معنی میں متداول ہے وہ اہل مشرق کی اصطلاح ہے۔ اندلس و بلاد مغرب میں پہنچ کر یہ لفظ کچھ اور ہی معنی میں مستعمل ہوا۔ وہاں علمائے فقہ کے لیے یہ مخصوص نہیں رہا بلکہ امراء، وزراء اور ائمہ نحو و لغت کے لیے بھی اس کے استعمال کا رواج ہوا۔ چنانچہ علامہ مقری کا بیان ہے۔

"وسمۃ الفقیہ عند ھم جلیلۃ حتیٰ ان المسلمین کانو یسمون الامیر العظیم[2]

JRASB . NS. VOL II. April, 1906, P. XIV[1]

[2] المقری نفح الطیب ج ۳ ص ۲۸۴ طبع مصر

منهم الذی یریدون تنویهه بالفقیه ... وقد یتولون للکاتب والنحوی واللغوی نقیه لانها عندهم اس فع السمات

(نفح الطیب ج ۱ ص ۱۰۳)

اب ہم قارئین کے سامنے الکتیبۃ کی ابتدائی سطریں پیش کرتے ہیں:

الحمد للّٰہ الذی جعل الادب فی جمیع ما للفنون من الاسواق، فاکھۃ شھیۃ الاذواق، تھدی فی الاطباق، مکللۃ بالاجباق، وریحانا عطر الانتشاق، فی انوف عشاق الکمال والکرم باولئک العشاق، وجعل بینہ نسبا ثابت الاستحقاق وبین النفوس الرقاق الخ

مقدمہ میں ابن الخطیب اندلس سے بلاد مغرب کی طرف آخری روانگی کا تذکرہ اپنے مخصوص طرز نگارش میں کرتا ہوا مغربی احباب کے لیے اس کتاب کی تالیف کا ارادہ ظاہر کرتا ہے کہ غرناطہ کے بے تاج و تخت رئیس الوزراء کے پاس بجز علمی وادبی سرمایہ کے اور کیا باقی رہ گیا تھا جو اہل مغرب کے سامنے بطور تحفہ پیش کیا جاتا۔ مصنف کے الفاظ درج ذیل ہیں۔

فجعلت الھدیۃ من جنس ما تشتوق الیہ النفوس الغنیۃ، وتتجر فی اسواقہ الھمم السنیۃ من وضع یستظرف، واختراع الیہ یستشرف. واثر یدل علی طول المتوسل وطریقۃ المتعرف المسترسل، یظھر منہ مصرف عنایتہ، وشرح کنایتہ، وبیان غایتہ ومرعی رعایتہ، وتبین ماوراء صحیفتہ من عنوانہ، ویخبر فذالکہ عن تفصیل دیوانہ، وینوب مکتوبہ عن لسانہ، فیما ینتحل من احسانہ فجمعت فی ھذا الکتاب جملۃ دائرۃ، وکتیبۃ ظافرۃ ممن لقیناہ ببلدنا الذی طوینا جدید العمر فی ظلہ، وطاردنا قنائص الآمال فی حرمہ وحلہ، ما بین من تلقینا افادتہ، واکرمنا وفادتہ الخ

چند سطروں کے بعد ذیل کی عبارت ملتی ہے۔

والمقصود انما ھو الماع بتعریف، وجلب ادب ظریف، بل التماس انعام ممن یقف علیہ وتشریف، وان ینظر النقص بعین کمالہ ویعذر المھدی فی تقصیرہ واستعمالہ، فاللّٰہ لا یکلف العبد فوق احتمالہ، وسمیت ھذا المجموع بالکتیبۃ الکامنۃ فیمن لقیناہ بالاندلس من شعراء المائۃ الثامنۃ،

یستدل بہ من مباشرة علیٰ نبل من کنا نعاشرہ، ولیقف من بین ادرسہ علیٰ فضل من کنا نمارسہ، وان کان جالب مثل ھذا الی البلاد المشہرقیۃ اعز اللہ اھلھا وامن حزنھا وسھلھا جالب تعبۃ الی غدیر، وحبابۃ الی کاس مدیر فالعذر الی الوسع مصروف ولا تجودین الا بما تجد مثل معروف الخ

ابن الخطیب کے قلم سے شعراء و ادبا کے تذکرہ میں دو کتابیں التاج المحلی اور الاکلیل الزاھر پہلے ہی نکل چکی تھیں۔ الکتیبۃ میں بعض تراجم ان دونوں کتابوں سے منقول ہیں۔ التاج المحلی کا ذکر مقدمہ میں ان الفاظ میں آتا ہے:-

وقد کنت جمعت فی الزمان المنصرم قبل ان یرسل اللہ علیٰ شبابنا سبیل العرم وقبل ان یعتاض الشیب بحال الھرم، وخلف البھرام[1] مائۃ شاعر و عشرۃ، وسمیتہ بالتاج المحلی فی مساجلۃ القدح المعلیٰ۔

شعراء الکتیبۃ کے حسب ذیل تین طبقے ہیں:-

۱- طبقۃ الخطباء النصحاء والصوفیۃ الصلحاء (ورقہ ۳ ب ورقہ ۳۱ ب):

اس طبقہ کے شعراء کی تعداد اکتیس (۳۱) ہے۔ ان کی شاعری کے متعلق ابن الخطیب کی رائے مندرجہ ذیل ہے:-

قلت وھذہ الطبقۃ اھلھا اعلام سراوۃ ومجادۃ، ولیسوا بحجۃ فی اجادۃ، الا من جری منھم مجری افادۃ فی وجادۃ، ومظنۃ الاجادۃ فی ھذا الکتاب ھم طبقۃ الشعراء والکتاب؛

۲- طبقۃ القضاۃ (ورقہ ۳۱ ب۔ ورقہ ۴۵ ب): اس طبقہ میں کل چوبیس ۲۴ شاعر مذکور ہیں ان میں سے قاضی ابو جعفر احمد بن عتیق شاطبی کا ترجمہ "الاکلیل" سے اور قاضی ابو جعفر احمد بن محمد المعافری، قاضی ابو الحسن احمد بن یحییٰ التمیمی، قاضی احمد بن محمد الشاشی القیسی کے تراجم "التاج المحلی" سے منقول ہیں۔ اس طبقہ کے متعلق

---

[1] ابو الحسن بن سعید کی تصنیف کا نام، یہ کتاب الاحاطۃ اور نفح الطیب کے اہم مصادر میں سے ہے۔

مصنف کا تبصرہ یہ ہے :۔

" وهذه الطبقة منحطة فى البيان، لاقتصار مدائحها على عموم الاديان، وما يصدر عنها على جهة الافتنان "

۳۔ طبقة الكتاب والشعراء (ورقہ ۵۴۔ ورقہ ۱۱۹) اس میں شعراء کی تعداد انچاس ہے۔ ان میں سے ابوالقاسم محمد بن محمد، ابو اسحٰق ابراہیم بن یحیٰی، ابو علی حسین بن عبدالحکیم، ابو عمر یحیٰی بن ابراہیم کے تراجم " الاکلیل " سے اور ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد القیسی، ابو بکر محمد بن احمد الجذامی، ابوالقاسم الخضر بن احمد، علی بن الجیاب، ابو بکر بن ابی عبداللہ ذی الوزارتین، ابو عبداللہ محمد بن ابی القاسم الکلبی کے تراجم " التاج المحلی " سے منقول ہیں۔ شاعری میں اسی طبقہ کو تقدم حاصل ہے۔ ابن الخطیب کے الفاظ یہ ہیں :۔

" وربما كانت هذه الطبقة متميزة بالاستحسان، تميز البركة بمطر النيسان و مظنة لدرر بحار اللسان الممنون بها على عالم الانسان "

یہ مخطوطہ احمد بن سلیمان بن احمد بن فرکون کے مندرجہ ذیل ابیات پر یکایک ختم ہوجاتا ہے۔

امولای عذرا عن مغیبی فلم اکن	لاغفل عن طرس لدیک اجیدہ
یراعی فی الکراس طوراً رکوعہ	وطورا بمحراب الدواة سجودہ
ولکن طرفی ... ...[1] .. لحظة	یفارقنی طوع اشتیاقی هجودہ
وھا.. ..[1] .. عرس النعمی التی	غیوث الھدایا کل یوم تجودہ
.. ..[1] .. فیہ شفاء ورحمة	ونجریھا فما یعز وجودہ
فما ذا عیسی انھیہ من شکر منعم	یولف بین النصب والنون جودہ

ان ابیات پر مجموعہ کا ختم ہوجانا بظاہر اس کے نقص پر محمول کیا جائے گا۔ لیکن حاشیہ پر کاتب کے الفاظ یہ ہیں :۔

الحمد لله، وجدت بالاصل هنا ما نصه الى هنا توجد هذه الكتيبة

---

[1] کرم خوردہ

ولعل مولفها اخترمته المنية قبل تمامها، واللّٰہ اعلم۔

اس امر کا قطعی فیصلہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی دوسرا مخطوطہ دستیاب نہ ہو جائے۔ اگرچہ ظن غالب یہی ہے کہ اس کی تکمیل سے پیشتر ہی ابن خطیب دشمنوں کی سفاکی کا شکار ہوا۔ افسوس ہے کہ ہیرس کی فہرست بھی اس مسئلہ پر کچھ روشنی نہیں ڈالتی۔

اس مختصر تعارف کے بعد ہم قارئین کرام کو ابن الخطیب کی نکبت وادبار کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اس کے دو زبردست دشمنوں کے نام لیں گے۔ جن کو ابن الخطیب نے اپنے عہد وزارت میں مناصب عالیہ پر سرفراز کیا تھا۔ لیکن وقت وبخت کی نامساعدت کے ساتھ ہی دونوں ابن الخطیب کی جان کے دشمن ہو گئے اور اس کے خلاف جو مقدمہ قائم کیا گیا تھا اس کی پیروی میں دونوں پیش پیش رہے۔ ان میں سے ایک ابوعبداللّٰہ بن زمرک ابن الخطیب کے مخصوص تلامیذ میں تھا اور دوسرا شخص قاضی ابوالحسن بن الحسن النباہی بڑی حد تک ابن الخطیب ہی کا نمک پروردہ تھا۔ کتاب الاحاطۃ کی تعریف کے دوران میں ابن الخطیب کے تعلقات ان دونوں سے نہایت شگفتہ وخوشگوار تھے۔ لہذا الاحاطہ میں ان کے تراجم تابندہ ودرخشندہ الفاظ میں نظر آتے ہیں۔ لیکن الکتیبۃ کی تالیف کا زمانہ ابن الخطیب کی کتاب زندگی کا سب سے زیادہ تیرہ وتاریک باب تھا، جبکہ اکثر احباب ومخلصین اس سے منھ موڑ چکے تھے اور اس سے کھلی عداوت کا اظہار اپنے قول وفعل سے کر رہے تھے۔ نیز فساد اعتقاد، الحاد وزندقہ اور جملہ مساوی ومثالب کو اس کی ذات سے منسوب کر رہے تھے۔ لہذا اس تالیف کے صفحات میں ابن الخطیب کی زبان قلم ان احسان فراموشوں کی مثالب نگاری میں طرارے بھرنے لگتی ہے اور ابوالحسن النباہی وابن زمرک کی تصویر الکتیبۃ میں کتاب الاحاطۃ کے برعکس نہایت مکروہ ومسخ شدہ نظر آتی ہے۔ ہم ابن زمرک اور ابوالحسن النباہی کے متعلق الکتیبۃ کی بعض عبارتیں جن کی طرف المقری نے نفح الطیب میں اشارہ کیا ہے ذیل میں نقل کریں گے۔ ان اقتباسات سے پہلے مقری کی چند سطروں کا پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

واعلم[1] ان لسان الدین لما کانت الایام له مسالمة لم یقدر احد ان یواجهه

---

[1] نفح الطیب ج ۳ ص ۶۳ (بحذف زوائد)

بمايدنس معاليه ... فلما قلبت الايام له ظهر مجنها ... اكثر اعداؤه فی شانه الكلام ونسبوه الی الزندقة ... والظن ان مقامه ... من لبسها بری ... وكان الذی تولی كبر محنته وقتله تلميذه ابو عبدالله بن زمرك ... ومن اعدائه الذين باينوه ... القاضی ابوالحسن النباهی اھ

وشمر القاضی ابن الحسن عن ساعد اذايته والتسجيل عليه بما يوجب الزندقة[1] كما سبق جميعه[2] مفصلاً محسنين اطلق لسان الدين عنان قلمه فی سب المذكور وثلبه واورد فی كتابه الكتيبة[3] الكامنة فی انباء المائة الثامنة من مثالبه ما انسی ماسطره صاحب القلائد فی ابن باجة[4] المعروف بابن الصائغ اھ

الكتيبة میں قاضی ابوالحسن کا ترجمہ ان لفظوں سے شروع ہوتا ہے :- اطروفة الزمن التی تجعل غرائبها الثمن، وقرد شاردة من قرود اليمن، ذنباً واحداقا، وفروة واشداقا، واشارة واصطلاحا، وخبثاً وسُلاحاً، لايفرق بينهما فی الشكل، وقرب الغائط من الاكل، تشغل به الصبيان اذا بكت، وتتملح بذكره الزهاد بعد ما نسكت وعن كل شيئ امسكت الخ

قاضی کے متعلق جو عجیب وغریب واقعات اس کتاب میں درج ہیں ان میں سے ایک ہمارے قارئین بھی سنیں -

حدث من يوثق به من العدول قال: جری بين يديه الحديث الشهير الجاری بمجالس القضاة: البيعان بالخيار مالم يتفرقا، فقال لی: سبحان الله يافقيه! كانوا فی القديم مثلنا فی البادية يتبايعون بالخيار والفواكه كما نتبايع بالحبوب من

---

[1] نفح : ۳ / ۷۴

[2] رسالہ النباھی الی ابن الخطیب، نفح الطیب ج ۳ ص ۶۵ — ۷۰ ایضاً ص ۹۸، ۲۶۹

[3] الکتیبۃ کا نام نفح الطیب ج ۳ ص ۶۵ اور ص ۲۴۴ میں بھی آیا ہے نیز ابن الخطیب کی تصنیف کے بیان میں (ج ۴)

[4] قلائد العقیان: ص ۳۴۶ – ۳۵۳، طبعہ سلیمان الحرائری ۱۲۷۷ھ

القمح والشعیر، (ورقہ ۵)

اسی کتاب میں ابن الخطیب، قاضی نباہی کو "مجسوس"[1] کا لقب دیتا ہے اور اس پر مزید ذیل کا "املوحہ" ہے:۔

وقال بعض فضلائهم: سمعته یقول: تنکرون علی ما یکثر تردده فی کلامی من لفظ جسوس، کانّه لیس من کلام العرب ولا من الفاظ القرآن فقلنا له: اما فی کلام العرب فربما، وامّا فی القرآن فلا نعرفه. فضحک وقال سبحان الله! اعد النظر، فقلنا: والله مانعرفه: فقال: الم یقل الله فی القرآن: ولا تجعسوا ولا یغتب بعضکم بعضا، فقلنا: والله ماقال الله ذلك قط وانما قال تجسسوا قال: فاسترجع وقال: یافقیه! حفظ الصغر، (ورقہ ۵ ب)

یہ تو الکتیبۃ کی باتیں ہیں معلوم نہیں کتاب خلع الرسن فی التعریف[2] باحوال ابن الحسن میں کیا کیا فضائح ومثالب بیان کیے ہوں گے! ابن الخطیب کے غیظ وغضب کا دوسرا نشانہ ابن زمرک[3] ہے۔ اس کے ترجمہ کی چند سطریں پیش کی جاتی ہیں:

هذا الرجیل والتصغیر علی اصله، وان لم یعب السهم صغر نصله مخلوق من مکیدة وحذر، مفطور اللسان عن هذیان وهذر، کثیرا الالتفات والاخراس خبیث ان شکر، خدع ومکر، ودس فی الصفو العکر، وان رمی واقصد، فالله اعلم بما قصد، الاانه فی البخت بخت نصر عند من اعتبر وتبصر، بینما هو فی المطبخ یغسل البرم، ویعشل الضرم اذا به یفترش السندس ویفتح سیفه القدس الخ (ورقہ ۱۰۸ ب)

---

[1] نفح الطیب ۳/۶۵

[2] نفح الطیب ۳/۶۵، ۷۴، ۹۰، ۴۴۹

[3] ابن زمرک کا ترجمہ، نفح الطیب ۴/۲۷۴، الدرر الکامنۃ ج ۴ ص ۱۲-۳۱۳

ہم لسان الدین بن الخطیب جیسے گرفتار مصائب و محن کو اس ہجو نگاری میں معذور سمجھتے ہیں اور ابن الخطیب کے مشہور و معروف اختصاصی علامہ مقری کے ان الفاظ پہ سلسلۂ کلام کو ختم کرتے ہیں:

واعلم ان للسان الدین بن الخطیب الغایة فی المدح والقدح فتارة علی طریق الترسل وطوراً علی غیرها، وقد اقذع وبالغ رحمه الله تعالیٰ فی هجو اعدائه بما لا تحتمله الجبال وهو اشد من وقع النبال۔

(ج ۳ ص ۷۴)

مالک ابن نویرہ کا واقعہ

اور

حضرت خالد بن ولید

حضرت ابو بکر صدیق نے مرتد اور باغی قبائل کی سرکوبی کے لیے جو گیارہ لشکر مختلف اطراف میں روانہ کیے تھے ان میں ایک لشکر حضرت خالد بن الولید کے ماتحت تھا۔ حضرت خالد پہلے بزاخہ آئے اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے مقام بطاح کا رخ کیا۔ یہاں پہنچ کر آپ نے دیکھا کہ مطلع صاف ہے تو آپ نے مختلف سمتوں میں مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے دستے (سرایات) اس غرض سے روانہ کیے کہ قبیلوں میں جو سرکش اور باغی ہوں ان کی سرکوبی کریں۔ قبیلہ بنو تمیم کی شاخ بنو یربوع کا سردار مالک بن نویرہ ایک شخص تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل مسلمان ہو گیا تھا۔ اور آپ کی طرف سے چند اور عمال صدقات کے ساتھ یہ بھی بنو تمیم کے صدقات وصول کرنے پر متعین تھا۔ لیکن جب اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی اطلاع ملی تو وہ مرتد ہو گیا اور جو زکوٰۃ و صدقات اس نے جمع کیے تھے ان کو مدینے بھیجنے کے بجائے قبائل میں تقسیم کر دیا۔

حضرت خالد کا ایک دستہ واپس آیا تو مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھ چند اور لوگوں کو گرفتار کر لایا۔ حضرت خالد کے سامنے یہ لوگ پیش ہوئے تو ارکان دستہ میں سے حضرت ابو قتادہ انصاری اور چند لوگوں نے شہادت دی کہ مالک بن نویرہ ارتداد سے تائب اور مسلمان ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت خالد نے اس کی پروا نہیں کی اور مالک بن نویرہ کو مع اس کے ساتھیوں کے قتل کر دیا۔ اور پھر اسی دن

مالک بن نویرہ کی بیوی ام تمیم سے جو بڑی خوبصورت تھی نکاح کر لیا۔ ابو قتادہ انصاری اس پر سخت برہم ہوئے اور حضرت خالد سے بڑی سخت کلامی کی۔ انھوں نے اس پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ مدینہ پہنچ کر خلیفہ رسول سے حضرت خالد کی شکایت کی اور پورا واقعہ کہہ سنایا۔ خلیفہ رسول نے جب اس پر کوئی توجہ نہیں کی تو ابو قتادہ فاروق اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عمر کو یہ پوری داستان سن کر بے حد غصہ آیا۔ صدیق اکبر کی خدمت میں حاضر ہو کر مطالبہ کیا کہ حضرت خالد کو فوراً معزول کیا جائے اور چونکہ ایک مسلمان کو عمداً قتل کیا ہے اور اس کی بیوی سے عدت گزرنے سے پہلے ہی نکاح بھی کر لیا ہے جو باطل ہے اس لیے ان کو قتل یا رجم کیا جائے۔ حضرت ابوبکر فرماتے رہے کہ خالد سے سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہے اس لیے ان کو معذور سمجھنا چاہیے۔ اور رہا معزول کرنا تو آپ نے فرمایا "جس تلوار کو اللہ نے اپنے دشمنوں پر بے نیام کر دیا ہے (اشارہ حضرت خالد کے لقب سیف اللہ کی طرف) میں اس کو نیام میں واپس نہیں کروں گا"۔ حضرت عمر نے ایک نہ سنی وہ اپنی بات پر برابر اصرار کرتے ہی رہے۔ آخر حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کو مدینہ بلایا، ان سے گفتگو کی جس میں حضرت خالد نے عذر خواہی کی۔ صدیق اکبر نے ان کا عذر قبول کیا اور پھر اسی عہدہ پر محاذ جنگ پر بھیج دیا۔ اور ساتھ ہی مالک بن نویرہ کا خوں بہا اس کے بھائی متمم بن نویرہ کو بیت المال سے ادا کیا۔

یہ واقعہ کا اصل متن ہے جس پر واقدی، حافظ ابن حجر، طبری، ابن اثیر، یعقوبی، ابن خلکان اور ابن شاکر ان سب کا اتفاق ہے۔ کتاب الاغانی، طبقات الشعرا اور خزانۃ الادب وغیرہا ادبی کتابوں میں واقعہ پر جو افسانہ کا رنگ چڑھایا گیا ہے اور یہاں تک لکھ دیا گیا ہے کہ حضرت خالد ام تمیم سے دیرینہ محبت رکھتے تھے (یھواھا فی الجاھلیۃ) وہ اس پر مستزاد ہے ہم اس افسانوی حصہ کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک واقعہ کے اصل متن کا تعلق ہے اور جس پر محدثین سے لے مورخین تک سب کا اتفاق ہے اس کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اب سوالات ذیل پیدا ہوتے ہیں :۔

(۱) اگر مالک بن نویرہ مسلمان تھا جیسا کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے تو حضرت خالد نے اس کو قتل عمداً کیا یا خطاءً۔

(۲) اگر عمداً کیا تو اُن سے قصاص لینا چاہیے تھا۔ پھر دیت دینے کا کیا موقع تھا اور وہ بھی
بیت المال سے۔
(۳) اور اگر وہ قتل خطا تھا تو اول تو یہ احتمال اس لیے بعید ہے کہ حضرت خالد سے اسی
طرح کا ایک واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بنو جذیمہ کے ساتھ پیش آچکا تھا۔
جس کا ملال حضور کو اس درجہ ہوا تھا کہ آپ نے اس واقعہ کی خبر ملتے ہی بارگاہ ایزدی میں
دو مرتبہ فرمایا اللّٰھُمَّ اِنِّی ابرء الیك مما صنع خالد اے خدا جو کچھ خالد نے کیا ہے میں اس سے بری ہوں
حضرت خالد ایسے صحابی سے بہت مستبعد ہے کہ دو تین سال کے اندر ہی اندر دو مرتبہ
ایک ہی قسم کی غلطی کا اور وہ بھی اتنی شدید ارتکاب کریں اور اچھا اگر یہ مان بھی لیا جائے
کہ مالک بن نویرہ کا قتل غلط فہمی کی بنا پر ہوا تھا تو پھر آخر اس کی کیا تاویل ہو گی کہ حضرت
خالد نے ام تمیم سے اس کی عدت گذرنے سے پہلے ہی نکاح کر لیا۔ اور جب ان کو غلطی
معلوم ہو گئی تو اس وقت بھی طلاق نہیں دی۔ اور نہ اس کو الگ کیا۔
(۴) حضرت ابو بکر جو شریعت اور اقامت حدود کے معاملہ میں بہت سخت تھے اس واقعہ میں
انھوں نے کیوں حضرت خالد کے ساتھ چشم پوشی کی اور اغماض کا برتاؤ درست رکھا۔
حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ عام روایت کے مطابق اس درجہ سنگین اور پیچیدہ ہے کہ مورخین اس میں
الجھ کر رہ گئے ہیں اور مذکورہ بالا سوالات کا جواب نہیں دے سکے ہیں۔ مصر کے مورخین حال شیخ
محمد خضری بک[1]، محمد حسین ہیکل[2]، رفیق بک العظیم[3] ان سب نے حضرت خالد کی طرف سے عذر خواہی
کی ہے۔ لیکن اس طرح کہ تاریخ کے ایک طالب علم کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی، ڈاکٹر
حسن ابراہیم حسن[4] اس واقعہ کا نہایت سرسری طور پر ذکر کر کے اسی طرح آگے بڑھ گئے ہیں کہ گویا اس

---

[1] تاریخ الامم الاسلامیہ ج ۱ ص ۱۷۷
[2] الصدیق ابو بکر ص ۱۵۷، ۱۵۸
[3] اشہر مشاہیر الاسلام ج ۱ ص ۱۵۳، ۱۵۴
[4] تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱ ص ۱۹۰

میں کوئی عجوبہ بات ہی نہیں ہے۔ اردو زبان میں دارالمصنفین اعظم گڑھ نے خلفائے راشدین، تاریخ اسلام حصہ اول اور سیر الصحابہ تین ایسی کتابیں شائع کی ہیں جن میں اس واقعہ پر بحث ہونی چاہیے تھی لیکن ان کو اس کے ذکر تک کی جرأت نہیں ہوسکی۔ اور وہ اسے صاف اُڑا گئے۔ البتہ مکتبہ برہان دہلی کی طرف سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی جو کتاب اشاعت اسلام کے نام سے شائع ہوئی ہے اس میں تین چار جگہوں پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مولانا مرحوم نہایت ذکی و ذہین اور بڑے فاضل بزرگ تھے۔ چنانچہ اس کتاب کو انھوں نے صرف واقعات کی کھتونی نہیں بنایا۔ بلکہ اہم واقعات کے اسباب و علل اور ان کے باہمی ربط پر فاضلانہ گفتگو بھی کی ہے اور طریق استدلال بڑی حد تک منطقیانہ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ واقعہ زیر بحث پر گفتگو کرتے وقت مولانا مرحوم نے بھی عام روایت کی پیروی کی ہے اور پھر اس پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کا وہ کوئی جواب نہیں دے سکے ہیں۔

چنانچہ مالک ابن نویرہ کی ارتداد پر پشیمانی اور ندامت کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں "مالک ابن نویرہ بے شبہ مسلمان ہو چکے تھے"[1] اب اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ خالد قتل مسلم کے مرتکب ہوئے تو مولانا جواب دیتے ہیں "مگر غلط فہمی سے مقتول ہوئے"۔ لیکن جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں اس کو محض غلط فہمی کہہ دینے سے کام نہیں چلتا کیونکہ اس سے ایک طرف تو حضرت خالد کی پوزیشن صاف نہیں ہوتی اور دوسری جانب ام تمیم کے ساتھ حضرت خالد کے نکاح کا جواز ثابت نہیں ہوتا"۔ چنانچہ جہاں تک امر اول کا تعلق ہے مولانا مرحوم کو حضرت خالد کی نسبت یہ الفاظ لکھنے پڑے ہیں۔

"تاہم ان سے (حضرت خالد سے) بعض ایسے امور بھی صادر ہوئے جو خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منشائے مبارک کے خلاف اور مصلحت اسلام کے منافی تھے"[2] یہ واقعہ بھی انھیں امور میں داخل ہو سکتا ہے جو حضرت خالد بمقتضائے مصلحت وقت بلا اجازت و استفسار اپنی رائے سے کر بیٹھتے تھے"[3] غور کرو حضرت خالد جس مرتبہ و عظمت کے صحابی ہیں اس کے پیش نظر مذکورہ بالا

---

[1] اشاعت اسلام ص ۶۸

[2] اشاعت اسلام ص ۲۴۴

اقتباسات کے کیا معنی ہیں۔ رہا امر ثانی یعنی ام تمیم سے نکاح تو مولانا اس کا جواب دیتے ہیں کہ قتل ہونے کے بعد ہر مسلمان کو جائز تھا کہ مقتول کی زوجہ سے عقد نکاح کرے[1] لیکن مولانا نے یہ نہیں بتایا کہ کیا مقتول کی زوجہ سے قبل انقضائے عدت بھی نکاح جائز ہے؟ واقعہ زیر بحث میں حضرت عمر کو جو شدید غصہ تھا اور جس کی وجہ سے انھوں نے حضرت ابوبکر سے خالد بن الولید کو رجم کرنے کا مطالبہ کیا تھا کیا اس کی بنیاد بھی "جائز نکاح" تھا؟ علاوہ بریں اس واقعہ کا یہ ایک پہلو نہایت اہم اور لائق توجہ ہے کہ اگر مالک بن نویرہ کو مسلمان مان لیا جائے تو حضرت عمر کا غصہ ہونا، حضرت خالد کو برا بھلا کہنا یہ سب درست اور بجا قرار پاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی خلیفۂ رسول حضرت ابوبکر کی معاملات شریعت میں غیر جانب داری مجروح ہو جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے عام مورخین کی نظر سے واقعہ کا یہ پہلو اوجھل ہو گیا ہے اور وہ اس پر سے اس طرح گذر گئے ہیں کہ گویا کوئی انہونی بات ہوئی ہی نہیں ہے۔

اس لیے سخت ضرورت ہے کہ اس واقعہ پر تحقیق و تنقید کے اصولوں کی روشنی میں مفصل کلام کر کے اس کی اصل حقیقت معلوم کی جائے۔ اس سلسلہ میں ہم کو امور ذیل پر غور کرنا ہوگا۔

(۱) مالک بن نویرہ کے حالات تاریخی ترتیب کے ساتھ؛

(۲) مالک بن نویرہ کے واقعۂ قتل کی اصل صورت۔

(۳) حضرت ابوبکر کی طرف سے حضرت خالد کے اختیارات اور ان کو ضروری ہدایات

(۴) مالک بن نویرہ کے اسلام کی شہادت اور اس کی حقیقت

(۵) ام تمیم کے ساتھ حضرت خالد کے نکاح کی اصل حقیقت

(۶) حضرت ابوبکر کا عمل اور اس کے وجوہ

(۷) حضرت عمر فاروق کا غصہ اور اس کے وجوہ

اب ہم تنقیحات بالا میں سے ہر ایک پر الگ الگ گفتگو کرتے ہیں۔

مالک بن نویرہ کے حالات

مالک بن نویرہ بنو تمیم کی شاخ بنو یربوع کا سردار تھا، شہسواری فیاضی اور بہادری میں بڑا نامور تھا عربی زبان میں ماءِ وَلا

---

[1] اشاعت اسلام ص ۳۴۷

کصدّاء اور مرعی ولا کالسعدان کی طرح جو فتیً ولا کمالک بہ طور ضرب المثل بولا جاتا ہے تو اس میں مالک سے مراد یہی مالک بن نویرہ ہے۔[1] اس کی کنیت ابو حنظلہ تھی اور اپنے بھائی مُتمم کی طرح خود بھی شاعر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل مسلمان ہوا تھا اور آپ نے اس کو اپنی طرف سے خود اس کے قبیلہ کے لوگوں سے صدقات کے وصول کرنے پر عامل مقرر فرمایا تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر بنو تمیم میں پہنچی تو جو لوگ عمال صدقات تھے ان میں بعض تو بدستور اسلام پر قائم رہے اور انھوں نے جو صدقات جمع کر رکھے تھے وہ مدینے بھیج دیے۔ بعض عامل متردد تھے کہ کیا کریں۔ لیکن مالک بن نویرہ کھلم کھلا مخالف اور مرتد ہو گیا اور اس نے جمع کردہ صدقات مدینہ بھیجنے کے بجائے خود قوم میں تقسیم کر دیے اور یہ شعر پڑھے ؎

فقلت خذوا اموالکم غیر خائف ولا ناظر فیما یجیءُ مِنَ الغد

فان قام بالدین المخوف قائم اطعنا وقلنا الدینُ دینُ محمدٍ[2]

ترجمہ: میں نے کہا کہ بغیر خوف کے اپنے اپنے مال لے لو اور یہ مت دیکھو کہ کل کیا ہوگا پھر اگر خوفناک دین (اسلام) کو کوئی قائم کرے تو ہم اس کی اطاعت کر لیں گے۔ اور کہہ دیں گے کہ دین تو محمد کا دین ہی ہے۔

یہ مالک بن نویرہ کے ارتداد کا پہلا قدم ہے۔ اب اس کے بعد سے لے کر قتل ہونے تک اس کے حالات کیا رہے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) مالک بن نویرہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ زکوٰۃ روک لی بلکہ جب سجاح بنت الحارث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات سُن کر ایک لشکر کثیر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے کے ارادہ سے جزیرہ (عراق) سے روانہ ہو کر بنو تمیم میں پہنچی تو مالک بن نویرہ نے

---

[1] کامل مبرد جلد ۱ ص ۶

[2] الاصابۃ ج ۳ ص ۳۳۶ ذکر مالک بن نویرہ تیسرے مصرعہ میں اصل کتاب میں "المحوق" چھپا ہوا ہے لیکن یہ غلط ہے صحیح "المخوف" ہے۔

اس کے ساتھ ساز باز کرلی ۔ اور اس جھوٹی مدعیہ نبوت کا دست راست ہوگیا۔

فلما انتهت الی الحزن راسلت مالك بن نويرة ودعته الی الموادعة فاجابها[1]

سجاح مقام حزن تک پہنچی تو اس نے مالک بن نویرہ سے خط وکتابت اور اس کو رفاقت کا رکی دعوت دی ۔ مالک نے اس دعوت پر لبیک کہا

(۲) سجاح مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھنا چاہتی تھی لیکن مالک بن نویرہ نے کہا کہ بنو تمیم میں جو لوگ مسلمان ہیں پہلے ان کی سرکوبی کرنی چاہیے ۔ چنانچہ سجاح نے یہی کیا اور مالک بن نویرہ نے اس کی ہر طرح مدد کی[2] ۔ سجاح کے ہاتھوں ان قبائل پر جو تباہی اور بربادی آئی چونکہ خود اس میں مالک بن نویرہ کا بھی دخل تھا اس بنا پر خود اس کے قبیلہ بنو یربوع کے لوگ اس سے نفرت کرنے لگے ۔ ابن اثیر کا بیان ہے :

وكرهوا ما صنع مالك بن نويرة[3]

اور مالک بن نویرہ نے جو کچھ کیا تھا یہ لوگ اُسے ناپسند کرتے تھے ۔

جن لوگوں نے مدینہ سے اپنا رشتہ مالک بن نویرہ جیسے آدمیوں کے بھڑکانے سے منقطع کرلیا تھا اب ان کی بھی آنکھ کھلی اور وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوئے[4]

(۳) سجاح کے عراق لوٹ جانے کے بعد زبرقان ، وکیع بن مالک اور سماعۃ جو مالک بن نویرہ کے ساتھ اسلام سے باغی اور مرتد ہو گئے تھے ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا چنانچہ حضرت خالد بطاح پہنچے تو ان لوگوں نے آپ کا استقبال کیا اور اپنے جمع کیے ہوئے صدقات آپ کے حوالے کر دیے ۔ لیکن مالک بن نویرہ کو اب بھی ہوش نہیں آیا ۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر اپنے قبیلہ میں گھس گیا[5]

---

[1] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۴۹۶ مطبوعہ الاستقامۃ قاہرہ سنہ ۱۹۳۹ء

[2] طبری ج ۲ ص ۴۹۶

[3] تاریخ الکامل ج ۲ ص ۲۷۰ مطبوعہ لیڈن

[4] ایضاً

[5] ایضاً

ایک مغالطہ اس موقع پر مورخین عام طور پر کہتے ہیں کہ مالک بن نویرہ اپنے کیے پر نادم ہوگیا تھا اور متردد تھا[1] لیکن یہاں ان کو مغالطہ ہوگیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مالک نادم اور متحیر و متردد ضرور تھا۔ لیکن کس بات پر؟ اپنے ارتداد اور حضرت ابوبکر صدیق خلیفۂ رسول سے بغاوت پر یا سجاح کے ساتھ مل کر بنو تمیم کو پامال کرنے پر۔ اگر پہلی صورت تھی تو اس کے لیے مانع کون سی چیز تھی؟ جب وکیع بن مالک، سماعہ اور امرائے بنو تمیم جن کی نسبت حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں:

فاستقبلهٔ امراء بنی تمیم بالسمع والطاعة[2]

بنو تمیم کے امرا نے حضرت خالد کا بطاح میں خیر مقدم کیا اور ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد کیا۔

ان سب نے حضرت خالد کے سامنے اپنے اسلام کی تجدید کرلی تھی تو مالک بن نویرہ بھی یہ کرسکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور قبیلہ میں جا بیٹھا۔ اصل یہ ہے کہ سجاح کی اعانت و امداد اور اس کے ذریعہ سے بنو تمیم پر جو سخت بربادی آئی تھی اس کی وجہ سے خود مالک کے قبیلہ کے لوگ اس کو برا سمجھنے لگے تھے۔ ایک طرف خود اس قبیلہ میں اس کی بدنامی اور رسوائی کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف وہ دیکھ رہا تھا کہ خالد بن الولید کی فوج برق و باراں کی طرح عداوت و مخالفت کے مراکز کو پامال کرتی چلی آرہی ہے[3] اور سجاح اپنی فوج کے ساتھ جزیرہ واپس جا ہی چکی ہے۔ ان سب باتوں کا مجموعی اثر یہ تھا کہ وہ نادم اور پشیمان تھا اور اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ اسی طرح مالک بن نویرہ نے سجاح کو مدینہ پر حملہ نہ کرنے کا جو مشورہ دیا ہے اس سے بھی مورخین کو مغالطہ ہوا ہے۔ اس کا یہ مشورہ مدینہ یا اسلام کی خیر خواہی پر ہرگز مبنی نہیں تھا بلکہ صرف اس لیے تھا کہ اس کی قوم اس سے اور سجاح سے دونوں سے سخت ناراض تھی اور

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۲ و کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۷۰

[2] البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۲

[3] مالک بن نویرہ نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے اسلامی فوج کی فتوحات کا جو ذکر کیا ہے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کو دوسرے لوگوں کی طرح اس سے بھی مغالطہ ہوگیا ہے (اشاعت اسلام ص ۶۷)

وہ ہرگز سجاح کو اپنی آزادی اور خود مختاری کے سلب ہوجانے کے ڈر سے مدینہ جانے کے لیے راستہ دینے پر رضامند نہیں تھی۔[1]

لیکن جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا۔ اگرچہ اس وقت، مالک بن نویرہ پر زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تنگ ہو رہی تھی اور وہ تنہائی محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن جہاں تک تجدید اسلام اور توبہ عن الارتداد کا تعلق ہے وہ اب بھی اپنی ضد پر قائم تھا۔ چنانچہ وہ گرفتار کر کے لایا جاتا ہے۔ اب اس کے بعد اس کا واقعۂ قتل کس طرح پیش آیا؟ اور اس کی اصل صورت کیا تھی؟ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیئے۔

واقعۂ قتل کیوں کر پیش آیا

اس سلسلہ میں متعدد روایات ہیں جو ترتیب وار حسب ذیل ہیں:

(۱) طبری، ابن اثیر، حافظ ابن حجر اور حافظ عماد الدین ابن کثیر نے جو عام روایت نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت خالد کا سریہ جب مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لایا اور حضرت خالد کے سامنے پیش کیا تو خود ارکان سریہ میں اختلاف ہوگیا۔ ایک گروہ تو اس کا قائل تھا کہ یہ قیدی مرتد ہیں لیکن چند دوسرے لوگوں نے جن میں ابوقتادہ انصاری بھی تھے یہ شہادت دی کہ یہ لوگ مسلمان ہوگئے تھے اور انھوں نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ حضرت خالد نے اختلاف کی یہ صورت دیکھ کر قیدیوں کو ایک جگہ بند کر کے رکھنے کا حکم دیا کہ دوسرے دن فیصلہ کریں گے۔ اتفاق سے اس شب میں سردی غیر معمولی تھی اس لیے آپ نے قیدیوں کے پہرہ داروں کو حکم دیا کہ "ادفئوا اسراکم" اس فقرہ سے آپ کی مراد یہ تھی کہ سردی سے حفاظت کی غرض سے قیدیوں کو کچھ اڑھا دو لیکن چونکہ بنو کنانہ کی بول چال میں "ادفاء" قتل سے کنایہ ہوتا ہے اس لیے پہرہ داروں نے قیدیوں کا کام تمام کر دیا۔ اب شور و غل کی آواز بلند ہوئی تو حضرت خالد نے خیمہ سے باہر نکل کر پوچھا "کیا بات ہے" اور جب آپ کو معلوم ہوا کہ ایک غلط فہمی کی بنا پر قیدی قتل کر دیے گئے تو آپ نے فرمایا "جو اللہ کا حکم ہوتا ہے وہ بہر حال ہو کر رہتا ہے۔"[2]

---

[1] طبری جلد ۲ ص ۴۹۸

[2] طبری جلد ۲ ص ۵۰۲

(۲) طبری کی ہی ایک اور روایت یہ ہے کہ حضرت خالد نے یہ معلوم کرنے کی غرض سے کہ مالک بن نویرہ نے ارتداد سے توبہ کی ہے یا نہیں اور اس کی نسبت کون سی شہادت لائق اعتبار ہے خود مالک بن نویرہ کو بلایا اور گفتگو کی اثنائے گفتگو میں مالک نے ایک مرتبہ کہا" میرا خیال تو یہی ہے کہ تمہارے صاحب (آقا۔ دوست۔ ساتھی) چنیں و چناں کہتے تھے" تمہارے صاحب (صاحبکم) کے لفظ سے مالک بن نویرہ کی مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ حضرت خالد نے پلٹ کر کہا" کیوں! کیا وہ تیرے صاحب نہیں تھے؟" یہ کہا اور تلوار سے گردن اڑا دی[1]۔

(۳) تیسری روایت یعقوبی کی ہے اور وہ یہ کہ ابو بکر صدیق نے حضرت خالد کو حکم دیا کہ بطاح میں مالک بن نویرہ ہے اس کا رخ کریں۔ خالد جب یہاں پہنچے تو مالک بن نویرہ کو طلب کیا یہ آیا تو اس کی بیوی ہمراہ تھی۔ خالد بولے:

واللہ لانلت ما فی مثابتک حتی اقتلک[2]	بخدا جو کچھ تیرا ٹھکانا ہے تو اس کو اس وقت تک نہیں پائے جب تک میں تجھ کو قتل نہیں کر دوں گا۔

اس کے بعد دونوں میں مناظرہ ہوا[3] اور آخر حضرت خالد نے مالک بن نویرہ کی گردن اڑا دی۔

(۴) چوتھی روایت جو ابن خلکان نے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ مالک بن نویرہ نے اپنی قوم سے زکوٰۃ وصول کر کے اس میں تصرف کر لیا تھا۔ حضرت خالد نے مالک بن نویرہ کو بلا کر اس سے باز پرس کی تو اس نے کہا کہ میں نماز پڑھتا ہوں لیکن زکوٰۃ کا قائل نہیں ہوں۔" حضرت خالد نے فرمایا" کیا تو نہیں جانتا کہ نماز اور زکوٰۃ دونوں ہی ایک ساتھ اللہ کا فرض ہیں۔ ایک کا اعتبار بغیر دوسرے کے نہیں ہے۔" اس کے جواب میں مالک

---

[1] طبری ج ۲ ص ۵۰۳

[2] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۸

[3] اصل کتاب میں فنظر چھپا ہوا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ طباعت کی غلطی ہے اصل فناظر ہوگا جس کی تائید طبری وغیرہ کی دوسری روایات سے بھی ہوتی ہے۔

بولا لیکن تمہارے صاحب تو چنیں وچناں کہا کرتے تھے۔ حضرت خالد نے پلٹ کر کہا "کیا تو ان کو (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو) اپنا صاحب نہیں سمجھتا۔ اس پر دونوں میں تیز کلامی ہوئی۔ مالک بار بار وہی ایک بات کہے جاتا تھا اور حضرت خالد بھی اس کے جواب میں وہی ایک فقرہ دہرائے جاتے تھے۔ آخر حضرت خالد نے اس کی گردن اُڑا دی [1]

تنقید روایات

مذکورہ بالا روایات میں سب سے زیادہ اور مشہور روایت پہلی ہے۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نے بھی اسی کو اختیار کیا اور اسی کو مدار بحث بنایا ہے [2] اور غالباً اس روایت کی طرف عام رجحان کا سبب یہ ہے کہ اس روایت کے مطابق مالک بن نویرہ کے قتل کی ذمہ داری زیادہ تر قیدیوں کے نگرانوں کے سر پڑ جاتی ہے اور خالد کی طرف سے عذر خواہی کرنے کا ایک وسیلہ ہاتھ آجاتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ روایت حسب ذیل وجوہ کی بنا پر لائق اعتبار نہیں ہے:

(الف) اگر سچ مچ بات یہی تھی کہ حضرت خالد نے حکم کچھ اور دیا تھا اور پہرہ داروں نے اس کا کچھ اور مفہوم لے کر قیدیوں کو قتل کر دیا تو سوال یہ ہے کہ یہ تو ایک بالکل کھلی اور واضح بات تھی پھر اس پر اس قدر ہنگامہ کیوں ہوا اور فاروق اعظم نے حضرت خالد پر قتل کا الزام کیوں لگایا۔

(ب) اگر یہ صرف غلط فہمی تھی تو پھر اس سے ام تمیم کے ساتھ قبل انقضائے عدت نکاح کا جواز کیوں کر ثابت ہوگا۔

(ج) ادفاء عربی زبان کا مشہور لفظ ہے۔ قرآن مجید اور حدیث دونوں میں گرم کرنے کے معنی میں مستعمل ہوا ہے پھر پہرہ داروں کا ذہن اس طرف کیوں کر منتقل ہوا کہ اس موقع پر حضرت خالد کی مراد عام۔ متداول اور مروج معنی کے برخلاف قتل کر دینا تھا۔

---

[1] ابن خلکان ج ۵ ص ۶۶ طبع جدید مصر

[2] اشاعت اسلام ص ۳۲۲

کہتے ہیں کہ بنو کنانہ کی زبان میں اس لفظ کے معنی قتل کر دینا ہیں لیکن ضرار بن الازور جنھوں نے مالک بن نویرہ کو قتل کیا ہے وہ تو بنو کنانہ میں سے نہیں بلکہ اسد میں سے تھے۔[1] اور چونکہ اس قبیلہ کے تعلقات بنو ہاشم کے ساتھ عزیزانہ اور قرابت دارانہ تھے چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پھوپی زاد بہن اور زوجہ مطہرہ حضرت زینب بنت جحش بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں اس بنا پر بنو اسد کی زبان وہی تھی جو قریش کی تھی پھر حضرت خالد کی مراد سمجھنے میں ضرار بن الازور کو مغالطہ کیوں کر ہوا۔

(د) اگر یہ سب کچھ حضرت خالد کی مراد اور منشا کے خلاف ہوا تھا تو ان جیسے سخت اور تشدد پسند شخص کو پہرہ داروں پر کم از کم عتاب اور غصہ کا اظہار تو کرنا چاہیے تھا لیکن یہاں کوئی عتاب نہیں، کوئی ناراضگی نہیں۔ اسے صرف اللہ کا حکم کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

(۱۰) بنو جذیمہ کے واقعہ میں حضرت خالد سے ایک غلط فہمی کا صدور ہو ہی چکا تھا۔ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملال ہوا تھا تو حضرت خالد ایسے جلیل القدر صحابی کی شان کے خلاف یہ بات ہے کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان سے پھر اسی نوع کی غلطی کا صدور ہو۔ ظاہر ہے ان وجوہ بالا کی بنا پر ادفاروالی روایت ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس کو قبول کیا جائے اور اس پر بحث وگفتگو کی بنیاد رکھی جائے۔

اب رہیں باقی تین روایتیں ان کو یکجائی طور پر سامنے رکھ کر غور کیجیے تو صاف معلوم ہو گا کہ اصل روایت وہی ہے جو ابن خلکان نے نقل کی ہے۔ باقی دونوں روایتوں میں اسی ایک روایت کے ٹکڑے لے لیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں یہ روایت اس لیے بھی اہم ہے کہ ابن خلکان نے اس کو وثیمہ بن الوشاء سے نقل کیا ہے یہ تیسری صدی کے جلیل القدر مورخ ہیں اور ان کی کتاب اگرچہ ناپید ہے مگر یہ کس پایہ کی کتاب تھی؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں کثرت سے اس کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ انھیں اقتباسات کو یکجا مرتب کر کے ایک جرمن فاضل نے کتاب الردہ لوثیمہ کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ ابن شاکر اس کتاب کی نسبت کہتے ہیں:

---

[1] العقد الفرید لابن عبد ربہ ج ۴ ص ۲۹۰

کتاب جید یشتمل علی فوائد کثیرۃ[1]   بہت عمدہ کتاب ہے جو فوائد کثیرہ پر مشتمل ہے۔

اس روایت سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ مالک بن نویرہ اگرچہ نماز کا قائل تھا لیکن وہ منکر زکوٰۃ تھا اور حضرت خالد کی بار بار تنبیہ کے باوجود اس نے زکوٰۃ کی فرضیت کا اقرار نہیں کیا اور یہ معلوم ہی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کا اولاً اور تمام صحابہ کا ثانیاً مانعین زکوٰۃ کے بارے میں کیا فیصلہ تھا؟ اس سلسلہ میں خاص حضرت خالد کے لیے حضرت ابوبکر کے احکام وہدایات کیا تھے؟ اب انھیں بھی معلوم کر لینا چاہیے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ حضرت خالد نے مالک کو قتل کر کے احکام خلافت کی خلاف ورزی کی یا ٹھیک ان کے مطابق عمل کیا۔

احکام وہدایات

خلیفۂ رسول نے حضرت خالد کو صاف اور صریح لفظوں میں یہ حکم دیا تھا کہ "جب تم کسی جگہ پر پڑاؤ ڈالو تو وہاں اذان دو اور اقامت کہو۔ اگر اس کے جواب میں وہاں کے لوگ بھی اذان دیں اور نماز قائم کریں تو تم ان سے اپنے ہاتھ روک لو لیکن اس کے بعد تم ان سے پوچھو کہ تم لوگ زکوٰۃ بھی ادا کرو گے یا نہیں؟ اگر وہ ہاں کریں تو تم اس کو قبول کر لو اور ان سے کوئی تعرض نہ کرو۔ لیکن اگر وہ ادائے زکوٰۃ سے انکاری ہوں تو پھر ان پر دھاوا بول دو اور مزید کوئی بات نہ کرو[2]"

حضرت خالد نے مقام بزاخہ میں بعض باغی اور مرتد لوگوں کو نہایت سخت سزائیں دی تھیں۔ یہاں تک کہ بعض مسلمانوں کو ناگواری ہوئی اور حضرت خالد نے جو کچھ کیا تھا خود اس کی اطلاع بارگاہ خلافت میں کی اس کے جواب میں خلیفۂ رسول نے جو کچھ لکھا اس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت خالد کے حدود واختیارات کس قدر وسیع تھے۔ صدیق اکبر لکھتے ہیں:

جد فی امر اللہ ولا تنین ولا تظفرن	اللہ کے کاموں میں پوری کوشش کرو اور سستی
باحد قتل المسلمین الا قتلتہ ونکلت بہ	نہ دکھاؤ۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کو قتل کیا ہے ان میں
غیرہ ومن اجبت ممن حاد اللہ او ضادّہ	کوئی شخص اگر تمھارے ہاتھ لگ جائے تو تم اس کو

---

[1] فوات الوفیات ج ۲ ص ۶۲۵۔ تذکرہ ابو زید رتیمہ

[2] طبری جلد ۲ ص ۵۰۲

فمن تری ان فی ذالک صلاحاً فاقتلہ[1] — قتل کردو اور دوسرے لوگوں کے لیے اس کو عبرت بناؤ ان کے علاوہ جن لوگوں نے اللہ سے مخالفت اور بغاوت کی ہے ان میں سے اگر کسی کے قتل کرنے کو تم مناسب اور مفید سمجھو اس کو بھی قتل کردو۔

اب غور کرو مالک بن نویرہ مرتد ہونے کے بعد سے برابر اپنی اسلام دشمن سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ سجاح سے ساز باز کرکے بنوتمیم میں جو مسلمان تھے ان کو قتل کرایا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام باندی بنوایا۔ پھر حضرت خالد بطاح پہنچے تو وکیع۔ سماعہ۔ قیس بن عاصم اور دوسرے امرائے بنوتمیم کی طرح مالک نے حضرت خالد کا خیر مقدم نہیں کیا۔ اس کے بعد جب پکڑا ہوا آیا تو حضرت خالد کی بار بار تنبیہ کے باوجود اس نے زکوٰۃ ادا کرنے کی ہامی نہیں بھری اور گفتگو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو برابر "صاحبکم" کہتا رہا۔ اور حضرت خالد کے یاد دلانے پر بھی اس کا اقرار نہیں کیا کہ حضور خود اس کے بھی صاحب ہیں۔ یہ سب کچھ ذہن میں رکھنے کے بعد یہ بھی دیکھو کہ حضرت خالد کے لیے بارگاہ خلافت کی طرف سے احکام و ہدایات کیا تھے؟ ان حالات میں حضرت خالد نے مالک بن نویرہ کو قتل کیا تو کیا بیجا کیا؟ یہ ایک مسلمان کا قتل تھا یا ایک انتہا درجہ سرکش۔ باغی اور فتنہ انگیز مرتد کا۔ حضرت خالد کا یہ فعل حضرت ابوبکر کے منشا اور مقصد کے خلاف تھا یا عین اس کے مطابق؟ ایک روایت میں تو یہ یہاں تک ہے کہ

وعزم علیہ لیقتلنّ مالکاً ان اخذہٗ[2] — حضرت ابوبکر نے حضرت خالد سے قسم لی کہ اگر مالک ان کے ہاتھ پڑ جائے تو وہ اس کا کام تمام کردیں۔

اب تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مالک بن نویرہ کے قتل کی نوعیت بالکل صاف اور واضح ہو جاتی ہے اب ہم کو اس شہادت کا بھی جائزہ لینا چاہیے جو مالک بن نویرہ کے اسلام سے متعلق ہے۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۹۱

[2] خزانۃ الادب ج ۱ ص ۲۷۳ خاص حضرت خالد اور مالک بن نویرہ کے واقعہ پر ابو ریاش احمد بن ابی ہاشم الہیثمی نے ایک رسالہ لکھا تھا۔ شیخ عبدالقادر بن عمر البغدادی نے اس رسالہ کے اقتباسات نقل کیے ہیں یہ فقرہ اسی اقتباس میں ہے۔

مالک بن نویرہ کے اسلام کی شہادت

یہ عجیب بات ہے کہ جو گروہ مالک بن نویرہ کو گرفتار کر کے لایا تھا اس میں اگرچہ کافی لوگ ہونگے لیکن مالک بن نویرہ کے اسلام کی شہادت صرف دو شخصوں سے مروی ہے ایک متمم بن نویرہ اور دوسرے ابوقتادہ انصاری۔ اول الذکر مالک بن نویرہ کے بھائی ہیں اور بھائی بھی کیسے؟ ان کے جو اشعار مالک کی مدح میں ادب کی کتابوں میں مذکور ہیں ان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ متمم کو اپنے بھائی کے ساتھ کس درجہ عقیدت وارادت اور محبت تھی۔ اب رہے ابوقتادہ انصاری تو اس میں شبہ نہیں کہ وہ جلیل القدر صحابی ہیں لیکن اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل دو باتیں قابل غور ہیں:

(۱) ایک یہ کہ حضرت ابوقتادہ نے جو شہادت دی ہے اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالک بن نویرہ نے اذان دی اور نماز پڑھی۔ لیکن ادائے زکوٰۃ کا کہیں کوئی ذکر نہیں[۱]۔ حالانکہ مالک بن نویرہ سے جو جنگ تھی وہ اسی بنا پر تھی محض اقامتِ اذان و صلوٰۃ کی شہادت سے اس کا اسلام اور توبہ عن الارتداد کیوں کر ثابت ہوسکتے ہیں؟

(۲) حضرت خالد بزاخہ سے جب بعزم بطاح روانہ ہونے لگے تھے تو انصار نے اسی وقت اعتراض کیا تھا اور انھوں نے حضرت خالد کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں جب ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ کئی منزل دُور جا کر حضرت خالد سے ملے[۲]۔ پس جب انصار کے تعلقات حضرت خالد کے ساتھ پہلے ہی سے خوشگوار نہیں تھے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان حالات میں حضرت خالد کے خلاف ایک انصاری کا بیان قانون شہادت کی رو سے کیا وزن رکھ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب ابوقتادہ انصاری نے مدینہ پہنچ کر حضرت ابوبکر سے خالد بن الولید کی شکایت کی اور پورا واقعہ بیان کیا تو حضرت ابوبکر نے اس کو چنداں اہمیت نہیں دی بلکہ بعض روایتوں میں تو یہ بھی ہے کہ آپ ابوقتادہ پر خفا ہوئے۔

بہرحال واقعات کی ترتیب اور مالک کے اسلام سے متعلق شہادت کی یہ خامی اور تشنگی

---

[۱] دیکھو البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۳۲۲، والاصابہ ج ۳ ص ۲۳۷

[۲] تاریخ کامل ابن کثیر ج ۲ ص ۲۷۲

ان سب کی روشنی میں صاف نظر آتا ہے کہ اگر مالک درحقیقت مسلمان ہو بھی گیا تھا تو اب یہ معاملہ اس کے اور خدا کے درمیان ہے۔ وہاں بے شبہ اس کو اجر ملے گا۔ لیکن جہاں تک دلائل اور شواہد کا تعلق ہے حضرت خالد اس کے قتل کرنے میں حق بجانب تھے اور ان پر قتل مسلم عمداً یا خطاءً کا کوئی الزام ہرگز عائد نہیں ہوتا۔

ام تمیم کے ساتھ نکاح اور اس کی حقیقت

اب ہم کو واقعہ کے دوسرے اہم جز یعنی ام تمیم کے ساتھ نکاح کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ واقعہ زیر بحث میں مالک بن نویرہ کے ساتھ اور بھی اس کے ساتھی مارے گئے تھے اور سب کا معاملہ ایک ہی تھا لیکن اس کے باوجود حضرت خالد کے خلاف جو شورش بپا ہوئی اس کی بنیاد مالک بن نویرہ کا ہی قتل تھا آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مالک بن نویرہ کا بھائی متمم بن نویرہ اپنے زمانہ کا نامور شاعر تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے مراثی اس سوز و درد کے ساتھ لکھے کہ انھوں نے آگ لگا دی۔ بچہ بچہ کی زبان پر پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ خود حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اگر شعر کہہ سکتا تو متمم کی طرح میں بھی اپنے زید کا مرثیہ کہتا۔ حضرت عائشہ نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو یاد کر کے جو شعر پڑھے ہیں اور جو صحیح بخاری میں مذکور ہیں وہ بھی وہی ہیں جو متمم نے مالک کے مرثیہ میں کہے تھے۔ لیکن متمم کی شاعری اور مرثیہ گوئی سے بھی بڑھ کر بڑی وجہ حضرت خالد کا ام تمیم سے جس کے حُسن و جمال پر سب کا اتفاق ہے، عقد نکاح کر لینا ہے۔

جہاں تک پہلی وجہ کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ یہ شعر کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ ان کی ذمہ داری حضرت خالد پر کیوں کر عائد ہو سکتی ہے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

رہی دوسری وجہ تو یہ غلط ہے کہ حضرت خالد نے مالک جس دن قتل ہوا ہے اسی روز نکاح کیا ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ مالک مرتد قتل ہوا تھا اس لیے اس کی بیوی کو حضرت خالد نے پہلے باندی بنایا پھر اس کو خریدا اور اس کے بعد آزاد کر کے اس سے نکاح کیا۔ چنانچہ ابن شاکر محمد بن عمر الواقدی اور ابوزید وثیمہ بن الوشاء کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

قیل انہ اشتراھا من الفئ و　　　　کہتے ہیں کہ خالد نے ام تمیم کو مال غنیمت میں سے

تزوج بها وقیل انها اعتدت بثلاث حیض ثم خطبها الی نفسه فاجابته[1]

خرید اتھا اور پھر ان کے ساتھ نکاح کر لیا تھا بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ام تمیم نے عدت پوری کی تھی، اس کے بعد خالد نے ان کو پیغام نکاح دیا تو انھوں نے قبول کر لیا۔

اسی سے ملتی طبری میں بھی ایک روایت ہے جس سے قتل مالک کے بعد فوراً نکاح کرنے کی تردید ہوتی ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

وتزوج خالدٌ ام تمیم ابنة المنهال وترکها ینقضی طهرها[2]

اور خالد نے ام تمیم سے شادی کی اور اس کو اس کے طہر کے پورا ہونے تک کے لیے چھوڑ دیا۔

ان روایات کے پیش نظر ہمارا قیاس یہ ہے کہ صورت یہ پیش آئی ہوگی کہ پہلے حضرت خالد ام تمیم کو باندی کی حیثیت سے اپنے تصرف میں لائے ہوں گے اور بعد میں جب اس نے اسلام قبول کیا ہوگا تو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا ہوگا۔ اڑانے والوں نے جب مالک بن نویرہ کے اسلام کا چرچا کیا تو چونکہ اب اس کی بیوہ باندی بن نہیں سکتی تھی اس بنا پر اس کے ساتھ حضرت خالد کی تسری کو انھوں نے "تزوج" سے تعبیر کر دیا۔ حالانکہ یہی ابو قتادہ انصاری ہیں جو اس خبر کے سب سے بڑے ذمہ دار راوی ہیں۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ کی موجودگی میں نکاح ہوا تھا تو انھوں نے صاف اس سے انکار کیا۔[3] اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) اگر درحقیقت واقعہ کی صورت یہی ہے تو حضرت خالد نے بغیر اذن خلیفہ کے، سبایا (گرفتارشدگان جنگ) میں کیونکر تصرف کیا۔ انھیں اس کا حق کہاں تھا؟

(۲) حضرت عمر فاروق نے حضرت ابوبکر سے یہ مطالبہ کیوں کیا کہ وہ خالد کو رجم کریں۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے حضرت خالد نے درپردہ حضرت ابوبکر سے اس کی اجازت لے رکھی ہو۔ یا ممکن ہے کہ انھوں نے بہ منظوری خلافت ایسا کیا ہو اور جنگ کے موقع پر بسا اوقات ایسا ہوتا ہی ہے۔

---

[1] فوات الوفیات ج۲ ص ۶۲۵، ۶۲۸

[2] طبری ج۲ ص ۵۰۲

[3] فوات الوفیات ج ۲ ص ۶۲۷

علاوہ بریں ہم ذیل میں ایک روایت پیش کرتے ہیں جس سے اس قسم کے معاملات میں بیک وقت حضرت خالد اور حضرت عمر فاروق دونوں کے نقطۂ نظر اور عمل و کردار کا فرق ظاہر ہوگا اور اس سے دونوں سوالات کا جواب مل جائے گا۔

خلافت فاروقی کے زمانہ میں حضرت خالد نے بنو اسد کی طرف ایک سریہ روانہ کیا جو ضرار ابن الازور کی ماتحتی میں تھا۔ اس سریہ نے ایک عورت گرفتار کی۔ ضرار نے ارکان سریہ سے درخواست کی کہ وہ عورت ان کو دے دیں۔ ان لوگوں نے اس درخواست کو منظور کرلیا اور ضرار اس عورت کو اپنے تصرف میں لے آئے۔ لیکن چونکہ ضرار نے یہ حرکت بغیر حضرت عمر کی اجازت کے کی تھی اس لیے ان کو بعد میں ندامت ہوئی اور انھوں نے حضرت خالد سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے کہا "نہیں اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے" لیکن ضرار نے اصرار کیا کہ اس بارہ میں حضرت عمر فاروق کو لکھ کر باقاعدہ اجازت حاصل کرلیں۔ اب حضرت خالد نے اس اصرار کے مطابق عمل کیا تو حضرت فاروق کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے حکم بھیجا کہ ضرار کو رجم کر دیا جائے اتفاق یہ ہوا کہ حکم فاروقی پہنچنے سے پہلے ہی ضرار کا انتقال ہوگیا۔ جب حضرت خالد کو یہ حکم ملا تو بولے "ما کان اللہ لیخزی ضرارا" "اللہ نہیں چاہتا تھا کہ ضرار رسوا ہوں"[1]۔

پس جس طرح اس روایت کے مطابق حضرت خالد نے مسلمانوں کی اجازت سے ضرار کے فعل کو جائز قرار دیا اسی طرح وہ اپنے معاملہ میں بھی ام تمیم میں تصرف کو جائز سمجھتے تھے لیکن جس طرح حضرت عمر فاروق بغیر اذن خلیفہ کے ضرار کے فعل کو حرام اور اس بنا پر اس کو مستحق رجم سمجھتے تھے اسی طرح ام تمیم کے معاملہ میں بھی وہ حضرت خالد کے عمل کو حرام اور ان کو مستحق رجم قرار دیتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے ام تمیم کے معاملہ میں تو حضرت ابو بکر خلیفہ تھے اس بنا پر اگر وہ خالد کے تصرف کو جائز قرار دیں تو پھر حضرت عمر کا مطالبہ رجم خالد قطعاً بے بنیاد ہو جاتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کے مطالبہ کو رد کر دیا۔

حضرت ابو بکر کا دیت ادا کرنا

جہاں تک مالک بن نویرہ کے نفس واقعہ اور حضرت خالد کے ام تمیم کے ساتھ نکاح کا تعلق ہے مسئلہ

---

[1] الاصابہ ج ۲ ص ۲۰۰ تذکرہ ضرار بن الازور

بالکل صاف اور واضح ہو جاتا ہے البتہ ایک ضمنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مالک بن نویرہ کے قتل کرنے میں حضرت خالد حق بجانب تھے اور اسی بنا پر حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کے شدید اصرار کے باوجود حضرت خالد کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی تو پھر آخر صدیق اکبر نے متمم بن نویرہ کو خوں بہا کیوں ادا کیا ؟

جواب یہ ہے کہ اگرچہ حضرت ابوبکر کی رائے میں حضرت خالد نے نہ کسی ناجائز فعل کا ارتکاب کیا تھا اور نہ انھوں نے اپنی حد سے آگے قدم رکھا تھا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابوبکر کو اس واقعہ کا ملال اس لیے ضرور تھا کہ اگر حضرت خالد مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے بجائے مدینہ بھیج دیتے تو جس طرح جنگ بزاخہ کے قیدی قرۃ بن ھبیرہ اور عیینہ بن حصن الفزاری وغیرہما مدینہ آکر مسلمان اور اپنے ارتداد سے تائب ہو گئے تھے اسی طرح اغلب کیا یقین تھا کہ مالک اور اس کے ساتھی بھی مسلمانوں کی طاقت و قوت اور عفو و حلم صدیقی کو دیکھ کر مسلمان ہو جاتے ، ایک طرف حضرت ابوبکر صدیق کا یہ ذاتی احساس و تاثر تھا اور دوسری جانب متمم بن نویرہ جو مسلمان تھا اس کی دلجوئی بھی ضروری تھی۔ اس بنا پر حضرت ابوبکر نے بہ طور تالیف قلب نہ بطور سزا خوں بہا ادا کیا اور یہی وجہ ہے کہ خوں بہا خالد بن الولید سے نہیں دلوایا بلکہ آپ نے خود بیت المال سے ادا کیا۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ فعل صرف حکومت کی سیاسی مصلحت بینی کا نتیجہ تھا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ صدیق اکبر جن کی فطرت اور طبیعت ہی اتباع و پیروی اسوہ نبوی بن گئی تھی انھوں نے اس موقع پر وہی کیا جو اسی نوع کے ایک موقع پر اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کر چکے تھے یعنی بنو جذیمہ کے چند افراد کے قتل پر جب خالد کے خلاف احتجاج ہوا تو آپ نے ذاتی ملال و حزن کے باوجود ایک طرف تو یہ کیا کہ حضرت خالد کو ان کے منصب سے الگ نہیں کیا اور دوسری جانب حضرت علی کی معرفت بنو جذیمہ کو نصف خوں بہا ادا کیا۔ لیکن یہ خوں بہا صرف ورثائے مقتولین کی دلجوئی اور ان کی تسلی و تشفی کی خاطر تھا۔ چنانچہ حضرتنا الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری[1] فرماتے ہیں:

---

[1] مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ (م ۱۹۳۲ء) مجموعی حیثیت سے آیت من آیات اللہ (بقیہ صفحہ ۹۸ پر)

وھذا عندی محمولٌ علی نحو مصالحة فافھم وان لم یطلبوہ بشئ لکنہ لم یرض ان یھدر دمھم [1]

اور یہ خوں بہا ادا کرنا میری رائے میں ایک طرح کی مصالحت پر مبنی تھا کیونکہ بنو جذیمہ نے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا تھا لیکن بایں ہمہ آپ نے پسند نہیں کیا کہ مقتولین کا خون رائگاں جائے۔

حضرت ابوبکر و عمر کا اختلاف

اب صرف ایک بات باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ آخر حضرت ابوبکر و عمر میں اس معاملہ میں اس قدر شدید اختلاف کیوں ہوا؟ تو ایک وہ شخص جس نے عہد نبوت اور اس کے بعد عہد خلافت صدیقی کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ دونوں بزرگوں کا یہ کوئی پہلا اختلاف نہیں تھا صلح حدیبیہ، غزوہ بدر، غزوہ احد اور پھر عین وفات نبوی کے وقت، اس کے بعد جیش اسامہ کی روانگی اور مانعین زکوٰۃ سے قتال کے مواقع پر بھی اسی نوع کے اختلافات ہو چکے ہیں۔ لیکن اختلافات کا نتیجہ کیا ہوا؟ حضرت عمر فاروق نے اپنی رائے سے رجوع کیا اور صدیق اکبر کی اصابت رائے، حسنِ تدبیر اور سنجیدگی فکر کی داد دی۔ چنانچہ معاملۂ زیر بحث میں بھی ایسا ہی ہوا۔ بعد میں اسی واقعہ کے سلسلے میں حضرت عمر نے اعتراف کیا کہ:

رحم اللہ ابابکر ھو کان اعلم منی بالرجال

اللہ ابوبکر پر رحم کرے۔ وہ میری بہ نسبت زیادہ مردم شناس تھے۔

حضرت عمر کے عہد خلافت میں متمم بن نویرہ نے پھر حضرت خالد سے قصاص کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۷) اور غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے صف اول کے علماء میں سے تھے ان کی حیات اور علمی کارناموں پر ایک تحقیقی مقالہ میری نگرانی میں قاری محمد رضوان اللہ نے لکھا ہے اور جس پر انھیں اسی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔

[1] فیض الباری ج ۴ ص ۱۱۷

مطالبہ کیا تو آپ نے اس کو رد کر دیا اور فرمایا :

لا ارد شیئا صنعه ابوبکر[1] ابوبکر جو کچھ کر چکے ہیں میں اس کو رد نہیں کرونگا

اصل یہ ہے کہ حضرت عمر کے مزاج میں اوّل تو یوں ہی تشدد پسندی بہت زیادہ تھی اور پھر اس وقت تک ان پر خلافت وحکومت کی براہِ راست ذمہ داری کا بارگراں نہیں پڑا تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکر صدیق کی نظر دقیقہ رس حکومت و سیاست کے جن باریک نکات پر رہتی تھی حضرت عمر سے اس کی توقع نہیں ہوسکتی۔ لیکن جب خود حضرت عمر اس بوجھ کے متحمل ہوئے تو حضرت ابوبکر کی پیش گوئی کے مطابق جو آپ نے وفات کے وقت حضرت عمر کے لیے اپنی نیابت و قائم مقامی کی سفارش و نامزدگی کرتے ہوئے کی تھی۔ خلیفۂ دوم میں بھی وہی اعتدال مزاج اور سنجیدگی طبع پیدا ہوگئی جو اس منصب عظیم کے لیے ضروری تھی۔

اب غور کرو مالک بن نویرہ کی اصل حقیقت کیا تھی؟ اور ہمارے مورخین کی بے توجہی کے باعث کیا سے کیا بنی رہی۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

---

[1] خزانۃ الادب ج ۱ ص ۲۳۸۔

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۵	الصابیین	الصابئین
۵	۱۵	قلن	فلن
۶	۱	صابئون کون	صابئون سے کون
۱۱	۱۶	توراۃ اخنوخ	توراۃ میں اخنوخ
۱۹	۱۴	اس کو	کو
۲۱	۱	ہیں	میں
۲۲	۸	اندازہ ہے	اندازہ ہوتا ہے
۲۲	۱۶	ہی	بھی
۲۴	۱۸	وہ	اور
۲۵	۱۶	کہا	×
۲۵	۱۸	رندیق	زندیق
۲۶	۹	متال	متاع
۲۷	۷	پہونچا	پہونچنا
۲۹	۳	نعی	نفی
۳۳	۳	انبتم	انتم
۳۳	۲۰	قطر	فطر
۳۶	۱۳	حنیفت	حنیفیت
۳۷	۱	عیسایت	عیسائیت

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۷	۵	کردے	کردیے
۳۹	۳	برات	برارت
۴۲	۷	اهتدأ	اهتدوا
۴۴	۲۱	التبيه	التنبيه
۴۵	۱۸	الوزداء	الوزراء
۴۷	۱۲	لكسه	لكنه
۴۸		جديبيه	حديبيه
۴۸	۱۴	حدبيبه	حديبيه
۵۱	۱۲	كتبا	كتب